نیل کے سنگ

〈سفر نامہ〉

ڈاکٹر الطاف یوسف زئی

نیل کے سنگ

ڈاکٹر الطاف یوسف زئی

حسنِ ادب فیصل آباد

جملہ حقوق بحقِ مصنف محفوظ ہیں

کتاب: نیل کے سنگ (سفرنامہ)

سفرنامہ نگار: ڈاکٹر الطاف یوسف زئی

کمپوزنگ: ڈاکٹر رابعہ بی بی ایبٹ آباد

نظرثانی: ڈاکٹر نذر عابد

تزئین وترتیب: ڈاکٹر ریشا قمر دکن انڈیا

ای میل: altafokasha@gmail.com

موبائیل نمبر: +923459370275

اہتمام: حسنِ ادب، فیصل آباد

سن اشاعت: 2022ء

تعداد: 500

قیمت: 500روپے

ARI ID: 1688711613335

Neel ke Sang

By

Dr Altaf Yousuf Zai

March, 2022

OPEN ACCESS

ECO FRIENDLY

Licensed under a Creative Commons Attribution 4.0 International License

انتساب

عکاشہ اور بالاچ

کے نام

کہ میرے خواب دمکتے ہیں جن کے چہروں پر

مشمولات

1۔ حدیثِ خواب گویم ۰۷

2۔ نیل کے سنگ ۰۹

❖ جادہ منزل ۱۲

❖ قاہرہ ماضی اور حال ۱۴

❖ سیر گیری اور ترمینل نمبرا ۱۶

❖ وادی سینا ۱۹

❖ کانفرنس یا جمگھٹا ۲۳

❖ مسجدِ صحابہ ۳۰

❖ خلیج نغمہ ۳۳

❖ قلوپطرہ ۳۶

❖ تھیوڈورا ۳۷

❖ عورت اور مصری تہذیب ۳۸

❖ مال مویشی، مصر و مانسہرہ ۳۹

❖ دھپ میں ڈھابہ ہوٹل ۴۰

❖ سینٹ کھیترائن ۴۲

❖ شرم الشیخ سے قاہرہ واپسی ۴۴

❖ قدیم وجدید قاہرہ ۴۵

❖ مصر، معیشت اور مطلق العنانیت ۴۸

❖ دریائے نیل ۴۹

❖ نیل کنارے دو دل ہارے ۵۲

❖ التحریر چوک ۵۴

❖ حدیقۃ العجائب ۵۶

❖ رعمیس دوم ۵۹

❖ قدیم مصری عقاید اور جانور ۶۱

❖ قدیم مصری عقاید اور عورت ۶۲

❖ جیزہ ۶۳

❖ قلعہ ایوبی ۷۱

❖ مسجد سلطان حسن اور رفاعی مسجد ۷۲

❖ مسجد علی ۷۶

❖ مصر، مذہب اور مساجد ۷۷

❖ براعظم افریقہ کی پہلی مسجد ۸۲

❖ مارجرجس، مفارہ، مریم اور موم بتی ۸۲

❖ مسجد حسین ۸۶

❖ خان الخلیلی بازار ۸۷

❖ پاکستانی رقص، ڈونلڈ ٹرمپ اور مرشد یوسفی ۹۰

❖ جامعہ الازہر میں اردو شناسی ۹۱

❖ جہاں گرد کی واپسی ۹۳

3۔ ناقدین کی آراء: ۹۵

❖ نیل کے سنگ سنگ پروفیسر غضنفر ۹۷

❖ ''نیل کے سنگ'' ایک اظہاریہ ڈاکٹر نذر عابد ۱۰۳

❖ ''نیل کے سنگ'' ایک تاثر پروفیسر ڈاکٹر شفیق انجم ۱۰۵

❖ ''نیل کے سنگ'' پر ایک نظر ایڈوکیٹ بشیر مراد ۱۰۹

❖ سفر ہے شرط۔۔۔ ڈاکٹر عارف حسین عارفؔ ۱۱۲

حدیثِ خواب گویم

سفر نامے کے بنیادی لوازمات میں سے ایک سفر بھی ہے۔ جب کہ اس میں برتی جانے والی پابندیوں میں سب سے اہم فسوں گری اور مبالغے سے اجتناب ہے۔ یہ لوازمات اور پابندیاں کسی اور ملک کے سفر پر نکلے سفر نامہ نگار کے لیے زیادہ مشکل نہ ہوں مگر سفر اگر مصر کا ہو تو سفر نامہ نگار کے لیے یہ دو دھاری تلوار پر چلنے سے کم نہیں۔

مصری تہذیب کی حقیقت جس قدر مسلمہ ہے اس قدر فسوں آمیز۔ یہاں کے نظارے اس حد تک تحیر آمیز ہیں کہ ان پر بات کرنی اور اس پر تحریر کرتے وقت طلسماتی ارتعاش اور فینٹا سی سے خود کو الگ کرنا ممکن ہی نہیں ہوتا۔

فوق الفطری ماحول اور فضا، قصہ در قصہ بنیادی حقیقت اور واقعے کے ساتھ ضمنی کہانیاں، غیر مرئی حقیقت، انسانوں کے علاوہ جانوروں اور چرند پرند سے منسلک واقعات، مرکزی کرداروں کی غیر معمولی طاقت اور حیثیت، معاون کرداروں کی فوجِ ظفر موج، مشکلات، رکاوٹوں کا ذکر، مذہبی اور دینی عقاید و تجربات، آسمانی اور انسانی قوانین کا ذکر اور نفاذ غرض وہ تمام لوازمات جو کسی افسانوی تحریر کے خاصے ہوتے ہیں، مصر پر لکھے سفر نامے کے بنیادی شرائط و لوازم بن جاتے ہیں۔

ان ہی لوازمات کی وجہ سے سفر نامہ داستان اور فسوں گری کا لبادہ اوڑھ لیتا ہے۔ لکھاری تہذیبی، تاریخی اور ذاتی داخلیت کا شکار ہو جاتا ہے۔ مسافر کے ساتھ بھی اس سفر پر کچھ ایسا ہی ہوا۔ جہاں بھی گیا حقیقتیں، حسین تخیل اور سچائیاں فینٹا سی کا روپ دھار لیتیں، چاہے یہ حقیقتیں فراعینِ مصر کی ہوں یا یہ سچائیاں وادیٔ سینا کی طلسماتی فضا کی ہوں جہاں ریب و تکذیب کی گنجائش نہ ہوتے ہوئے بھی میری فکر افسوں اور بالعکس فسوں کے ساتھ ابہام و سحر کی خواب آلودہ فضاؤں سے نہ نکل سکی۔

یہ میری خوش بختی تھی کہ مجھے دکتورہ بسنت، دکتورہ شائمہ، دکتور محمد علی اور دکتور محمود جیسے ہم سفر ملے جنھوں نے مجھے اس تحیر آمیز سفر میں حقیقت اور ابہام دونوں کے درمیان ایک تنے ہوئے رسے پر چلنے میں مدد کی اور یہاں پیش آنے والے واقعات، تاریخی حقیقتوں میں مجھے دھندلانے سے روکے رکھا۔

میرا یہ سفر ذات سے کائنات کی طرف تھا۔ وادیٔ سینا کی مذہبی اور تاریخی حیثیت ہو یا دریائے نیل کی اساطیری اہمیت، فراعینِ مصر کے طلسماتی کردار ہوں یا پیغمبرانِ خدائے برتر کے کرشماتی واقعات۔ میں ذات سے کائنات میں نکل کر یوں محسوس کرتا کہ میری ذات میں ایک کائنات ہے اور کائنات میں میری ذات۔ کبھی لگتا میں اپنی ذات سے بہت دور نکل آیا ہوں اور کبھی محسوس کرتا ہوں جیسے میں اسی جگہ ہوں اور یہ سفر صرف دائرے میں ہو رہا ہے۔

پس جو میں نے دیکھا اور محسوس کیا اس کو ''نیل کے سنگ'' کی شکل میں آپ سے شریک کیا۔ اب یہ میرا اختیار نہیں رہا کہ میرا یہ سفر ذات کا ہے یا کائنات کا، یا یہ سفر ہی نہیں محض فسوں گری ہے۔

ڈاکٹر الطاف یوسف زئی

نیل کے سنگ

قل سیرو فی الارض فانظرو کیف بداالخلق ثمّ اللہ
ینشیءُ النشاۃ الاخرۃ ان اللہ علی کل شی ء قدیر

ترجمہ:

آپ فرمادیں زمین میں سفر کر کے دیکھو۔اللہ کیوں کر پہلے بناتا ہے
پھر اللہ دوسری اٹھان اٹھاتا ہے۔بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے

آج مسافر جس منزل کی جانب عازمِ سفر ہے وہ مصر کی سرزمین ہے۔مصر کی جامعہ طنطا کے کلیہ فنون نے عصرِ حاضر کے ایک عفریت یعنی دہشت گردی سے بچاؤ اور تدارک کے لیے جب سماجی علوم اور ادب ولسانیات کے روشن میناروں اور منور دریچوں سے رائے مانگی اور اس پر مصاحبوں اور مکالموں کے لیے وادیٔ سینا کے صحت افزا مقام شرم الشیخ میں بیٹھک بٹھائی تو مسافر سے رہا نہ گیا اور رختِ سفر باندھا۔

مصر جانے والے تمام راستوں کو اگر شاہراہِ بزرگ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ہزار ہا سالوں سے ہزار ہا انسانوں نے اس سرزمین پر اپنے نقوشِ پا چھوڑے،کشادہ جبیں اور روشن خیال راہروانِ شوق نے اس سرزمین کو نسلِ انسانی کے لیے منبع نور بنایا اور دلوں کو بینائی بخشی۔بلاشبہ یہ ایک عام روش ہوتی تو پائے مال ہوتی مگر یہاں سبک ساران ساحل نے دھول دھول غبار کو،فروغِ وادیٔ سینا کو تگ وتاز بخشی۔

مسافر کو اس سفر اور وہاں ہونے والے مصاحبوں اور مکالموں میں شرکت کی دعوت دکتورہ بسنت نے دی تھی۔سماجی رابطے کی ویب سائٹ فیس بک پر ان سے مراسم قائم ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا۔فیس بک پر درج ان کی ذاتی معلومات اور لگی تصویر سے ان کی شخصیت کا اندازہ مشکل تھا مگر ملنے کے بعد ان کی شخصی اور علمی خوبیاں اور زیادہ نظر آئیں۔دکتورہ بسنت نے میری پروفائل سے میرے بارے میں بہت ساری معلومات حاصل کر لی تھیں۔وہ جانتی تھیں کہ میری ایک کتاب ''اردو نظم اور نائن الیون'' کے نام سے منظرِ عام پر آ چکی ہے۔جس میں دہشت گردی سے متاثرہ پاکستانی عوام کی صعوبتوں اور استعماری قوتوں کے ظلم و جبر کی کہانیوں کا ذکر ہے۔وہ یہ بھی جانتی تھیں کہ مسافر کا تعلق سوات سے ہے اور یہ جنت نظیر خطہ اس عفریت سے کس قدر متاثر ہوا ہے۔

جادہ منزل

اسلام آباد سے شرم الشیخ تک اگر ہوائی جہاز براہِ راست اڑان بھرے تو یہ سفر تقریباً سات سے آٹھ گھنٹے میں طے ہوسکتا ہے۔مگر اس سفر کی تکمیل کے لیے مسافر کو چوبیس گھنٹے لگے۔اسلام آباد کے ہوائی مستقر کی انتظار کے صاف شفاف شیشوں سے سعودی ائیر لائن کا دیو ہیکل ہوائی پرندہ کھڑا صاف نظر آرہا تھا۔اس پرندے کی منزل ریاض کا دلکش ائیر پورٹ تھا۔جہاں سے مجھے پانچ گھنٹے کے انتظار کے بعد اسی کمپنی کے جہاز سے قاہرہ کا سفر درپیش تھا۔تمام مسافر ٹکٹکی باندھے کبھی جہاز اور کبھی الیکترانی گھڑیال پر نظر ڈالتے،مسافروں کی جہاز میں جلد بیٹھنے کی خواہش جس رفتار پر چل رہی تھی گھڑیال کی سوئیاں اس کے ساتھ قدم ملا کر چلنے سے عاری تھیں۔لمحہ موجود منجمد تھا اور شوقِ پرواز کو پر لگے ہوئے تھے،مقیم رشتہ دار مسافروں کو دلاسا دے کر رخصت ہو رہے تھے کہ خیریت سے پہنچنے کی اطلاع ضرور دیں۔عازمین سفر اچھی نشست چاہے اپنی ہو یا پرائی کے حصول کے لیے ایک دوسرے پر سبقت لے جانے میں کوشاں تھے۔مسافر کو عازمین کی یہ حالت و حرکت دیکھ کر ایک دانا کی تحریر یاد آگئی،اقتدار کی مسند ہو کہ جہاز کی نشست،کرسی کے حصول کے اصول یکساں ہوتے ہیں۔جہاز میں داخل ہو کر بھی مسافروں کو چین نہ آیا کوئی آگے یا پیچھے بیٹھنے کے فوائد کو بیان کر رہا تھا اور کوئی دائیں بائیں بازو کی بحث میں الجھا ہوا تھا وہاں پیش و پس یہاں چین و چناں۔بعض مسافر محرموں کے ساتھ بیٹھنا چاہتے تھے اور بعض نامحرموں کے ساتھ۔ادھر دوستی کا دعویٰ اور کشش،ادھر ہوس کا جواب دعویٰ اور بہکاوا،سب متذبذب نظر آرہے تھے۔فیصلہ کرنا مشکل ہو رہا تھا۔بقول مختار مسعود اگر تذبذب لاحق نہ ہوتا تو ہر شخص خدائی کا دعویٰ کر بیٹھتا ،بیچارگی بشریت کی پہچان ٹھہری اور بے نیازی مشیت کا خاصہ۔

چار گھنٹے کی مسافت کے بعد جہاز نے ائیر پورٹ پر دم لیا۔اس ہوائی مستقر کا نام شاہ خالد انٹرنیشنل ائیر پورٹ ہے جو کہ سعودی دارالحکومت میں شمال کی جانب کوئی بیس کلومیٹر کے فاصلے پر

واقع ہے۔اس ہوائی مستقر کی مصروفیت اور آمدورفت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس سے سالانہ دو کروڑ ساٹھ لاکھ مسافر گزرتے ہیں ۔ یہاں لگ بھگ بارہ ہزار گاڑیاں کھڑی کرنے کی گنجائش ہے۔اتنے بڑے ائیر پورٹ میں قاہرہ کی طرف جانے والے جہازوں کا گوشہ کونسا ہوگا،مسافر کو اس حوالے سے ذرا پریشانی ہوئی ،مگر وہاں موجود نوعمر لڑکیوں نے یہ مشکل آسان کر دی۔ ہر نکڑ پر ایک اطلاعی بورڈ آویزاں تھا جس کے نیچے کھڑی ایک دو نوجوان لڑکیوں پر ذمہ داری عائد کی گئی تھی کی مسافروں کو نشانِ منزل سمجھانے میں ان کی مدد کریں۔نوجوان سعودی شاہ محمد بن سلمان نے سعودی روایات سے ہٹ کر ایک نئی راہ لی ہے اب سعودی عرب بدل رہا ہے ۔سعودی خواتین کو معاشرے میں بااختیار بنانے کی باتیں ہو رہی ہیں ۔انہی میں سے ایک لڑکی نے بتایا کہ قاہرہ کے جہاز تک پہنچنے کے لیے سیڑھی نمبر ۲۴ سے اترنا ہوگا،ساتھ یہ بھی بتایا کہ ابھی جہاز کی بورڈنگ شروع ہونے تک چھے گھنٹے انتظار کرنا ہوگا مسافر نے ان سے پوچھا کہ یہاں کوئی چائے خانہ ہوگا جہاں سے چائے پی جا سکے تو لڑکی نے دائیں طرف ہاتھ سے اشارہ کیا۔مسافر چائے خانے کی تلاش میں آگے بڑھا تو وہاں ایک خوبصورت مسجد نظر آئی اس مسجد کی خوبصورتی بے مثال تھی ۔داغی شیشے (Stained glasses) سے بنی یہ مسجد واقعی ایک شاہکار تھی ۔ یہاں برقی قمقموں کی منور روشنیاں داغی شیشے سے منعکس ہوتیں تو پرزم کی طرح کئی رنگوں کی قوسِ قزح بکھیرتیں ۔نماز پڑھنے کے بعد یہاں سے چائے خانے کی راہ لی۔اللہ اللہ کر کے یہ چھے گھنٹے مسجد اور چائے خانے میں گزر گئے ۔سعودی ائیر کے جہاز نے مسافر کو قاہرہ پہنچایا۔رات کا آخری پہر شروع ہو چکا تھا مسافر کو شرم الشیخ کے لیے جس جہاز پر سوار ہونا تھا اس نے اگلے دن گیارہ بجے اڑان بھرنی تھی یعنی مزید ۱۲ گھنٹے انتظار۔ مجھے ائیر پورٹ پر یہی بتایا گیا کہ شرم الشیخ کے لیے ترمینل نمبر 1 سے جانا پڑے گا۔میں اس وقت ترمینل 3 پر کھڑا تھا۔ہوائی مستقر کے باہر کئی گاڑیاں بغیر کرایہ لیے ترمینل نمبر 1 پر مسافروں کو پہنچا رہی تھیں ۔میں بھی ایک میں سوار ہوا اور ائیر پورٹ کے

عقب میں چلنے والی سڑک کے ذریعے ترمینل 1 پر پہنچ گیا۔

قاہرہ ماضی اور حال

مسافر کے قویٰ جواب دے چکے تھے مگر جسمانی تھکن سے زیادہ روحانی آسودگی مسافر کو رت جگے پر اکسا رہی تھی۔ کیا واقعی میں قاہرہ میں ہوں؟ اپنے آپ سے بار بار اس سوال میں خوشی کی وہ سرشاری تھی جو تھکاوٹ کے احساس کو مغلوب کر رہی تھی۔ ایک طرف قاہرہ شہر کی بڑی عمارات اور فلک بوس مینار اپنی حقیقت مجھ پر آشکار کر رہے تھے تو دوسری طرف میری پیشوائی کے لیے ایک عظیم تہذیب، ایک بزرگ تاریخ، قرآنی آیات کے عملی نمونے اور چشم کشا تفسیریں چشم براہ تھے۔ مصری تہذیب اور تاریخ کے بارے میں تھوڑی بہت جانکاری تھی مگر شہر قاہرہ کب وجود میں آیا اور کن کن اقوام نے اس کو اپنا مسکن بنایا۔ اس حوالے سے کوئی خاطر خواہ معلومات نہ تھی۔ اس کے باوجود میں سحر قاہرہ سے آزاد نہ تھا۔ اس شہر کے رعب و دبدبے اور اس کی تاریخی حیثیت سے چشم پوشی ممکن نہ تھی۔ کہتے ہیں کہ یورپ کے تہذیبی مرکز پیرس کو جب چھینک بھی آتی ہے تو یورپ کو زکام ہو جاتا ہے۔ کچھ ایسا ہی اعزاز عرب دنیا میں قاہرہ کو حاصل ہے براعظم افریقہ کا یہ شہر جو ابتدائے اسلام میں ہی عربی شہر بن گیا تھا اور زبان و مذہب عربوں کا اختیار کر لیا تھا وہ آج عرب دنیا کا سب سے زیادہ پڑھا لکھا اور علم و فنون کی درسگاہوں کا محور و مرکز بن چکا ہے اس لیے قاہرہ میں جو سماجی، سیاسی لہر اٹھتی ہے وہ پوری عرب دنیا میں محسوس کی جاتی ہے۔ اس میں کوئی مبالغہ نہیں ہے کہ مغربی افریقہ سے مشرقِ وسطیٰ تک پھیلی ہوئی عرب دنیا پر ثقافتی اور علمی سطح پر حکمرانی مصر کی ہے۔

قاہرہ یونانی شاعر ہومر کا کوئی مردہ شہر نہیں جو تاریخ کی نظر سے اوجھل ہو۔ قاہرہ ائیر پورٹ پر مصری اور انگریزی کھانوں کے ایک بڑے ریستوران کے بغل میں ایک کتاب گھر بھی تھا جس میں مصری تہذیب، تاریخ فراعنہ، عثمانی، مملوکی اور جدید مصری سیاسی اور معاشرتی احوال پر عربی،

فرانسیسی، انگریزی اور روسی زبانوں میں کئی کتابیں اور کتابچے موجود تھے۔ اتنی ڈھیر ساری تہذیبوں کے مسکن قاہرہ کے بارے میں جب تاریخ کی کتب کی ورق گردانی کی تو جانکاری کی بے چینی کا فشار مزید بلند ہو گیا، معلوم ہوا کہ قاہرہ دریائے نیل کے کنارے براعظم افریقہ کا سب سے بڑا جبکہ دنیا کا سترہواں بڑا شہر ہے جس کی موجودہ آبادی تقریباً ڈیڑھ کروڑ ہے۔ آبادی کے اضافے نے دریا کے مشرق و مغرب کے خط کو مٹا دیا ہے۔ کسی زمانے میں یہ شہر دریا کے مشرقی کنارے آباد تھا۔ آبادی بڑھتی گئی ضروریات نے تصرفات کو جنم دیا تو انیسویں صدی میں شاہ اسماعیل نے مغربی کنارے ایک جدید بستی بسائی، یوں دریا قدیم و جدید شہر کے درمیان حد فاصل بن گیا۔ حکمران اور ثروت مند طبقے نے مغرب سے مشرق پر عنان حکومت کس دی۔ مشرق میں عبادت گاہوں مساجد اور غربت جبکہ مغرب میں فلک بوس عمارات، سرکاری دفاتر اور جاہ و حشم نے ڈیرے ڈال دیے۔ شاہ اسماعیل کی جدید بستی سے قبل بھی مصری حکمرانوں کی اقامت گاہیں اور دارالحکومت وقتاً فوقتاً تبدیل ہوتے رہے۔ حضرت عیسیٰؑ سے تین ہزار سال قبل فرعون مینس نے بالائی اور زیریں مصر کو ملا کر جس علاقے میں اپنا پایہ تخت بنایا تھا وہاں پر موجود میمفص کے آثار اب بھی اس دور کی شاندار روایات و عمارات کے امین ہیں۔ یہ علاقہ موجوہ قاہرہ سے خاصے فاصلے پر ہے۔ تاریخ میں ہیلیو پولیس اور اسکندریہ سے مصریوں پر حکمرانی بھی منقول ہے۔

مسافر کو زیادہ دلچسپی اس کتاب سے تھی جس میں مسلمانوں کی قاہرہ میں آمد کا تذکرہ تھا۔ اس کتاب میں مسلمانوں کی آمد کا سال ۶۴۲ء لکھا ہوا تھا۔ مسلم سپہ سالار عمرو ابن العاص نے یہاں فتح کے جھنڈے گاڑے۔ پہلا فوجی مستقر اس جگہ کو بنایا جہاں مسلم افواج نے خیموں کی بستی بسائی۔ عربی میں خیمے کو فسطاط کہتے ہیں اسی لیے شہر کا نام فسطاط ہی کہلایا اور اسی فسطاط میں بننے والی مسجد براعظم افریقہ کی پہلی مسجد بن گئی۔

اسلام دشمنی میں پیش پیش وہ عمرو ابن العاص جو نجاشی کے دربار میں سفیر رسولؐ عمر بن امیہ

خمری کو قتل کرنے حاضر ہوئے تھے کو اسلام کی آفاقیت کا احساس وادراک ہوا تو اسلام دوستی میں بھی کسی سے کم نہ رہے۔ذات السلاسل اور سواع کی مہمات پر نبی اکرمؐ کے نائب بن کر گئے اور کامیاب لوٹے ۔مدینہ سے دس دن کی مسافت پر رہائش پذیر بنو قضاعہ کو دائرہ اسلام میں داخل کرنے اور سواع دیوی کے عبادت گزاروں کی سرکوبی کرنے کے بعد مصر کو مشرف بہ اسلام کرنے ہزاروں کلومیٹر فاصلہ طے کر نے والے اس جرنیل کے بارے میں مسافر سوچوں میں مگن تھا کہ کسی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا ،میں نے مڑ کر دیکھا تو وجیہہ خوش پوش آدمی نے مجھے السلام علیکم کہا۔پوچھا آپ دکتور الطاف یوسف زئی ہیں؟ میں نے اثبات میں سر ہلایا اور ان سے پوچھا آپ مجھے کیسے جانتے ہیں وہ میری بات سمجھنے سے قاصر تھے۔یہی سوال جب میں نے انگریزی زبان میں پوچھا تو عربی لہجے میں انگریزی زبان میں یوں گویا ہوئے ''دکتورہ بسنت تولدمی اباوت یو'' ''مائی نیم از محمد علی''۔

سیر گری اور ترمینل نمبر 1

قاہرہ سے شرم الشیخ جانے کے لیے نیل نامی ہوائی کمپنی کے جہاز میں محمد علی نے میرے ساتھ سفر کرنا تھا جلد ہی ہم دونوں میں ذہنی ہم آہنگی پیدا ہوئی اور مصریوں کے بارے میں میری رائے اچھی بننے لگی۔قاہرہ کے ائیر پورٹ کے ترمینل نمبر 1 پر عجیب چہل پہل تھی، بھانت بھانت کے لوگ، بھانت بھانت کی بولیاں بولتے عجیب وغریب لباس زیب تن کیے جوق در جوق اس ترمینل کی انتظار میں ٹولیوں کی شکل میں بیٹھے تھے۔سرخ، کالے، بھورے، زرد جتنے انسانوں کے رنگ اس سے زیادہ بولیاں ۔مسافر نے کرنسی تبادلے کی دکان پر موجود ایک خوش گفتار مصری سے پوچھا کہ یہ لوگ کن کن علاقوں سے یہاں آتے ہیں اور اس ترمینل سے کس منزل کی طرف جا رہے ہیں؟۔جواب ملا کہ دنیا بھر سے آتے ہیں؟ مگر زیادہ تر لوگ روس سے آتے ہیں۔میرے استفسار پر کہ اس ترمینل میں رقوم کے تبادلے کی کتنی دکانیں ہیں،اس نے کہا چار۔پوچھنے پر پتہ چلا کہ صرف ایک دکان پر روزانہ تقریباً ایک لاکھ امریکی ڈالر مصری پاؤنڈ میں تبدیل ہوتے ہیں

چار دکانوں پر یہ تبادلہ ماہانہ ایک کڑور بیس لاکھ تک ہوتا ہوگا یہ آمدنی صرف سیر گری سے حاصل ہو رہی ہے۔اس ترمینل سے اسکندریہ اور شرم الشیخ کی طرف صرف ان جہازوں کو اڑان بھرنے کی اجازت تھی جو مصری عوام وحکومت کی ملکیت میں تھے اور جہازوں کے کرائے بھی ان سیاحوں نے ڈالروں میں بھرنے ہوتے ہیں۔

مسافر نے سال پہلے عصرِ حاضر کے ''مہا گرو'' اور ''استاذ الاساتذہ'' Google جس کے شاگرد قریہ قریہ، کوچہ کوچہ اور یم بہ یم پائے جاتے ہیں، سے پوچھا کہ انسان سیر گری پر سالانہ کتنا خرچ کرتا ہے تو جواب دیتے دیر نہ لگی کہنے لگے دنیا بھی کی سالانہ آمدنی کا دس فیصد سے زیادہ سیر و تفریح میں اڑ جاتا ہے۔اس پیشے سے وابستہ انسانوں کی تعداد تین سو تیرہ ملین بتائی جو پوری دنیا کے نوکر پیشہ اور تجارت پیشہ افراد کا نو فیصد سے زیادہ بنتا ہے۔مسافر کو تین سو تیرہ کا ہندسہ بھا گیا۔اللہ کے دین کو شر پسندوں سے بچانے کے لیے نبی آخر الزماںؐ نے بدر کے میدان میں جن جانثاروں کو اتارا تھا ان کی تعداد بھی تین سو تیرہ تھی۔دنیا بھر میں ایک ارب سے زیادہ مسلمان جو آج بس رہے ہیں اس کی وجہ یہی بدری سپاہی ہیں کہ جن کے پاس صرف آٹھ تلواریں، چھے زرہیں، جنگلی لکڑی کے ترشے ہوئے تیر، ستر اونٹ اور صرف دو گھوڑے تھے جبکہ مقابلے میں قریشی لشکرِ جرار۔طبلِ جنگ بجنے سے پہلے نبیؐ خدا سے دعا مانگتے ہیں۔'' خداوند! اگر یہ چند جانیں آج ختم ہوگئیں تو پھر تیری عبادت کرنے والا کوئی نہ ہوگا۔'' اے میرے مولا تیرے نام اور دین کی سربلندی کے لیے میں اتنے ہی نام لیوا جمع کر سکا آج ان مخالفین پر غلبہ عطا فرما تا کہ آنے والی نسلوں تک یہ دین مبین پہنچے۔نبی کو بشارت ہوئی۔'' وکلمتہ اللہ ھی العلیا''۔

میں نے سیر گری میں سب سے زیادہ کمانے والے ممالک کی فہرست پر نگاہ ڈالی تو وہاں صرف ایک مسلمان ملک ترکی کو دسویں نمبر پر کھڑا دیکھا۔نیل کی ہوائی کمپنی کے جہاز میں ساتھ بیٹھے عین شمس یونیورسٹی کے پروفیسر محمد علی سے پوچھا کہ اقوامِ عالم نے ہم سے منہ کیوں پھیر لیا

ہے۔اب دنیا جہاں کے لوگ مسلمان ملکوں کی طرف جانے سے کیوں کتراتے ہیں۔اس کے باوجود کہ تاریخ ،تہذیب اور فطرت سے معمور خطے مسلمانوں کے زیرِ تسلط ہیں۔دکتور علی نے جواب دیا ''تیرارزم''۔نائن الیون کے واقعے کے بعد دنیا ہم سے نفرت کرنے لگی ہے۔ہم سے ان کو خوف آتا ہے، وہ دنیا کے امن کے لیے ہمیں ناسور سمجھتے ہیں ان کے خیال میں اگر دنیا کو اس وقت کوئی بڑا خطرہ ہے تو وہ مسلمانوں سے ہے۔میں نے کہا کہ نائن الیون کے واقعے کے پیچھے تو امریکی رویہ تھا جو وہ عرصہ دراز سے مسلمانوں کے ساتھ برت رہا تھا۔عراق، فلسطین، ایران اور کشمیر میں ہونے والے مظالم کے پیچھے جو قوتیں کارفرما ہیں ان کو امریکیوں کی شہہ حاصل ہے۔ میں نے علی صاحب سے پوچھا کہ نائن الیون کے بدلے کے لیے افغانستان اور پاکستان کی سر زمین کو کیوں چنا گیا۔ہزاروں فوجیوں کو زرہ بکتر پہنا کر F-16،B-52 اور ڈرون طیاروں سے ان ممالک کے نہتے شہریوں کو ڈیزی کٹر اور کارپٹ بمبوں سے کیوں نشانہ بنایا گیا۔جن کے نوے فیصد آبادی کو یہ بھی معلوم نہیں کہ جڑواں مینار (Twin Towers) کس بلا کا نام ہے اور وہ ہوا باز کون تھے جنھوں نے امریکی معیشت کی اس دیوہیکل نشانی کو تارِ عنکبوت ثابت کیا۔میں نے محمد علی سے پوچھا کہ آپ کو معلوم ہے کہ نائن الیون کے اس حملے میں شامل انیس قزاقوں میں پندرہ سعودی عرب، دو متحدہ عرب امارات اور ایک لبنانی تھا جبکہ ان کا سرغنہ محمد عطا مصری تھا۔محمد علی جو جہاز کی کھڑکی سے دریائے نیل کی روانی کا مزہ لے رہا تھا چونک اٹھا اور حیرت سے مجھے تکتے ہوئے کہنے لگا یہ تو میرے لیے خبر ہے۔میں نے ٹھنڈی آہ بھری۔حضرتِ غالبؔ نے کان میں کہا، خاک ہو جاؤ گے ''تم''''اس'' کو خبر ہونے تک۔میں نے محمد علی سے پوچھا کہ جب امریکہ اور اس کے اتحادی افواج کلسٹر بمبوں سے ہسپتالوں ،اسکولوں ،مدرسوں ،کھیل اور تفریح کے میدانوں غرض ہر جگہ بارود کی بوائی کر رہی تھیں اور ڈیزی کٹر اور کارپٹ بمباری سے معصوم اور نہتے افغان اور پاکستانی عوام کے خون سے خوف اور دہشت، قتل و غارت اور تباہی اور بربادی کے وہ مناظر

عالمی امن کے چہرے پر پینٹ کر رہے تھے۔ ہر ''مہذب'' چہرہ خونخوار نظر آنے لگا اور تورا بورا، گوانتا ناموبے نے ہلاکو اور چنگیزی بربریت کو بھی شرمسار کر کے نئی علامتوں اور استعاروں کو جنم دیا تو ان واقعات کی ''خوشبو'' آپ تک نہیں پہنچی؟ میرے چہرے پر غصے اور خفگی کے آثار سے محمد علی کو میری کیفیت کا اندازہ ہو گیا اور گفتگو کا رخ موڑنے کے لیے مجھ سے پوچھا تم پہلی دفعہ مصر آئے ہو نا؟ یہ نیچے جبلِ طور ہے اور وہ ہموار زمین جو نظر آ رہی ہے وہ وادیٔ سینا ہے۔ علی صاحب کا تیر کارگر ثابت ہوا۔ جہاز نے اپنا ایک شہپر ہلکا سا جھکایا اور ایک ایسی وادی کی طرف مڑا جس نے مسافر کی ذہنی پرواز بھی اپنے ساتھ موڑ لی۔ مسافر کا ذہن اور جہاز دونوں مانوس صحرا اور نامانوس فضا میں محوِ پرواز تھے۔

بہ قول شخصے فضا میں راستے کہاں ہوتے ہیں صرف راستے کا احساس ہوتا ہے۔ فضا بے کراں اور بے نشاں ہے نہ کسی پرانے قافلے کا نقشِ قدم نہ کسی نئے کارواں کے لیے سنگ میل موجود، نہ پس انداز اور زادِ راہ۔ فضا پاک ہے اور اس کا مرکب بہت لطیف، اس لیے فضا میں مادہ تقریباً معدوم ہو جاتا ہے اور سمت موہوم۔ صرف ایک خلا رہ جاتا ہے۔ ہر طرف خلا ہی خلا ایک خلا کے بعد دوسرا خلا فکر کو اس کا سرا نہیں ملتا۔ تاہم اس خیال سے ڈھارس ہوتی ہے کہ اگر خلا بسیط ہے تو کوئی محیط بھی تو ہو گا۔

وادیِ سینا

جس وادی مقدس طویٰ کا ذکر قرآن میں ملتا ہے اس کی وسعت قلبی واضح نظر آ رہی تھی۔ گرمی سے نڈھال پیاسی وادی نے اپنی چونچ بحیرہ احمر میں ڈال رکھی تھی، بحر ہند کا پانی جزیرہ نما عرب کے یمنی ساحلی علاقے راس منہلی اور براعظم افریقہ کے راس سیاں کے درمیان کوئی بیس میل کی ایک تنگ گھاٹی سے گزر کر افریقہ اور ایشیا کے درمیان حدِ فاضل کھینچتا ہے جو وادیٔ سینا پہنچ کر دو حصوں میں منقسم ہو جاتا ہے مشرقی حصے کو خلیج عقبہ جبکہ مغربی حصے کو خلیج سویز کہا جاتا ہے۔ قاہرہ سے وادیٔ سینا جاتے ہوئے خلیج سویز کو عبور کرنا پڑتا ہے۔ اس حصے میں موسیٰ ؑ نے اپنی قوم کو فرعونی مظالم سے نجات کے لیے پار کرایا تھا اور اسی بحر میں فرعون منفتاح غرق ہوا تھا۔

مصر، سعودی عرب، اسرائیل اور اردن کی سرحدیں خلیج عقبہ میں ملتی ہیں۔ سعودی عرب اسی ساحل 'پرنیوم' نامی بستی بسا رہا ہے۔ اس جدید بستی کے بارے میں یہ بات کہی جا رہی کہ یہاں عیش وعشرت کے وہ سارے ذرائع موجود ہوں گے جن کے لیے مغرب ومشرق کے عیاش طبقات دنیا کے کسی بھی کونے میں جانے سے انکار نہیں کرتے۔

جہاز نے سمت بدلنے کے لیے جب داہنا پنکھ نیچے کیا تو کھڑکی سے خلیج سویز ایک نیلے ربن کی طرح نظر آ رہی تھی۔ محمد علی نے اشارہ کیا کہ وہ پانی خلیج سویز ہے۔ انہوں نے نہر سویز کی لمبائی چوڑائی اور اس پر برطانوی، امریکی اور فرانسیسی قبضے کی تاریخ بھی بیان کی اور بڑے فخر سے جمال عبدالناصر کی بہادری اور اس نہر کے قومیانے کے عمل کو سراہا۔ انہوں نے کہا کہ ۱۸۶۹ء میں تعمیر ہونے والی اس نہر سے انگلستان اور ہندوستان کے درمیان اس بحری فاصلے کو افریقہ کے گرد چکر لگا کر طے کیا جاتا تھا جو چار ہزار میل کم ہو گیا۔ میں نے کہا اس سے شاید مصر کو فائدہ ہوا ہو گا مگر ہندوستان خاص طور پر مسلمان ہندوستانیوں کا نقصان ہوا۔ اس نے تعجب سے پوچھا وہ کیسے؟ میں نے کہا انہی دنوں میں مغل بادشاہت ہندوستان سے ختم ہوئی اور انگریز راج کا دور دورا۔ انگریزوں نے ہندوستان کو غلام بنانے کے لیے اسی نہر میں اپنے بحری بیڑے ڈال کر ''سونے کی چڑیا'' یعنی ہندوستان پر قابض ہوئے۔ محمد علی نے کہا یہ بھی میرے لیے ایک خبر ہے۔

جہاز کے شہپر نے دریچے اور نیلی ربن کے درمیان بصری راستہ روک لیا مگر چشم تخیل کا دریچہ ابھی کھلا تھا۔ مسافر نے محمد علی سے پوچھا کہ تمھیں ایک اور خبر نہ دوں کہ اس نہر کے کھودنے اور بحر احمر کو بحیرہ روم سے ملانے سے حضرت عمر فاروقؓ نے فاتح مصر حضرت عمرو ابن العاص کو روکا تھا۔ علی نے پوچھا کہ کیوں اس میں کیا قباحت تھی؟ حضرت عمرؓ تو بہت بڑے منتظم اور رعوام کے خیر خواہ حکمران تھے ان کے دورِ خلافت میں تو کئی نہریں بنائی گئی تھیں۔ میں نے کہا اس وقت عمرو ابن العاصؓ کو روکنے کا ان کا فیصلہ درست تھا۔ ہجرت کے اٹھارویں برس جب نجد میں قحط نے

ڈیرے ڈالے تو انھوں نے تمام گورنروں کو حکم دیا کہ مکہ اور مدینہ میں اناج اور غلے کی فراہمی یقینی بنائی جائے۔ سب سے بڑا مسئلہ شام اور مصر سے سرزمین نجد کو ترسیل کا تھا۔ خشکی کا راستہ دور افتادہ اور سفر کے لیے کٹھن تھا۔ عمرو ابن العاصؓ نے حضرت عمرؓ کے کہنے پر قاہرہ سے چند میل کے فاصلے پر واقع قسطاط سے ایک نہر نکالی یوں دریائے نیل کو بحر احمر سے ملا دیا۔ مصر سے اناج جہازوں اور کشتیوں میں لاد کر مدینہ منورہ کی قریبی بندرگاہ میں اتارا جاتا۔ مسافر اس تحیر میں گم تھا کہ ۶۹ کلومیٹر نہر ان قحط زدہ انسانوں نے صرف چھے ماہ کے قلیل عرصے میں کیسے کھودی ہوگی۔ اقبالؔ نے الجھن دور کر دی کہ ''مومن ہو تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی''

انہی کی طرح بے تیغ سپاہیوں نے جنگ خندق میں ساڑھے تین میل لمبی تیس فٹ چوڑی اور پندرہ فٹ گہری خندق صرف بیس دنوں میں تیار کی تھی۔ محمد علی نے کہا آپ نہرِ امیر المومنین کی بات کر رہے ہیں۔ میں نے کہا جی ہاں اور اسی نہر کی کامیابی نے حضرت عمرو ابن العاص کو یہ تقوویت بخشی کہ خلیفۃ المسلمین سے اجازت مانگی کہ فرما نامی علاقے سے بحیرہ روم کا درمیانی فاصلہ بہت کم ہے ان کو ایک نہر کھود کر ملا نہ دیا جائے؟ تو خلیفہ نے منع کیا اور خط لکھ بھیجا کہ اگر ایسا ہوا تو یونانی بحری بیڑوں میں بیٹھ کر سرزمین عرب پر حملہ آور ہو جائیں گے اور جو حاجی حجاز مقدس کے لیے عازم سفر ہوتے ہیں ان کو لوٹ لیا کریں گے۔ حضرت عمرؓ کی دور اندیشی سے حجاز کے حاجی تو یونانی حملوں سے محفوظ رہے مگر افسوس انیسویں صدی کے آخری قرن میں بننے والے اس راستے نے ہندوستان پر مسلمانوں کے خلاف انگریزوں کی گرفت مزید مستحکم کی اور ہندوستان سے انگلستان ترسیلاتِ زر جبکہ انگلستان سے ہندوستان ترسیلاتِ آلاتِ حرب میں آسانی ہوئی۔

جہاز آسمان کی فضاؤں سے اتر کر زمین پر دوڑنے لگا تو چشم تخیل نے بھی انگڑائی لی۔ محمد علی نے کہا یہ شرم الشیخ ہے مصر کا ایک صحت افزا مقام یہاں لاکھوں سیاح ہر سال آتے ہیں عام طور پر یہاں موسم شدید گرم ہوتا ہے مگر جنوری اور فروری میں معتدل ہوتا ہے تم اچھے موسم میں آئے ہو ان

دنوں گرمی زیادہ نہیں ہوتی، سمجھو بہار ہے۔ میں نے کہا بہار تو ہر جگہ خوبصورت ہوتی ہے میں نے کشمیر، سوات اور مانسہرہ کی بہاریں دیکھی ہیں۔ یخ بستہ اور برفیلے پہاڑوں پر جب بہار آتی ہے تو ہر سو ہریالی بچھ جاتی ہے پھول کھل اٹھتے ہیں اور پرندے خوشی سے چہچہانے لگتے ہیں یوں لگتا ہے زمین اپنی ساری خوبصورتی آسمان کے سامنے آشکار کر رہی ہے اور چشمِ فلک سے محبت کا خراج مانگ رہی ہو۔ چیڑ، چنار اور صنوبر کے درخت اپسراؤں کی مانند مہکتے پھولوں کے درمیان کھڑے ناظرین کو مسحور و مسرور کرنے میں اپنی تمام تر خوبصورتی نچھاور کر رہے ہوتے ہیں۔ حسن بے پراوہ کو اپنی بے حجابی پر کوئی ندامت محسوس نہیں ہو رہی ہوتی۔ شرم الشیخ میں بھی بہار کی خوبصورتی کم نہ تھی بلاشبہ یہاں چیڑ و چنار کے درخت ناپید تھے اور سبزہ ہریالی کی جگہ ریگ ریگستان اور اٹھکیلیاں سوجھتی پروا بحیرہ احمر سے اڑ کر نیل گگن اور نیل کے مسکن تک اپنی رعنائیاں اور لطافتیں بکھیرتی ہے۔ اس کی خوش نصیبی ہے کہ قدیم شہنشاہوں کے مقبروں اور نبیوں کے نقوش پا سے ہم کلام ہو کر ایشیا اور افریقہ کے مقدس شہروں کی عظمتِ رفتہ کے الہامی نغمے الاپتی ہے۔ ہم ہوائی مستقر سے ایک خوبصورت لیموزین گاڑی میں بیٹھ کر جولی حویلی گالف ریزرٹ پہنچے وہاں دکتورہ بسنت ہماری منتظر تھیں۔ مخصوص عربی لباس زیب تن کیے بسنت نے عربی لہجے میں اردو بولتے ہوئے کہا ''مرحبا مرحبا یا دکتور الطاف مصر میں آپ کا استقبال ہے'' اردو نگر سے ہزاروں میل دور ایک عرب خاتون اسے اردو زبان میں اتنا طویل جملہ اتنی روانی اور آسانی سے سن کر خوشی کی انتہا نہ رہی۔ سر پر گلابی رنگ کا سکارف اور اودے رنگ کا مختصر کوٹ پہنے خوش شکل بسنت کی آنکھوں میں خوشی کے جلوے دیدنی تھے۔ ان کی گفتگو سن کر یوں لگا:

ڈلی ہو مصر کی جیسے زبان ایسی تھی
میں دیکھوں لہجہ کبھی دیکھوں شین قاف بدن

میرا اور محمد علی کا سامان ہوٹل میں موجود ملازمین میں سے ایک کے حوالے کر کے دکتورہ

بسنت ہمیں ہوٹل کی لابی میں لے گئیں جہاں طنطا یونیورسٹی کے رئیس جامعہ اور مصری حکومت کے ایک وزیر کانفرس کے مندوبین سے مصافحہ کرتے اور گال سے گال ملاتے ہوئے بغل گیر ہوتے ۔ مجھے مصافحے اور معانقہ میں کوئی دقت نہیں تھی مگر گال سے گال ملانے والا مرحلہ مشکل تھا۔ مجھے اس سے پہلے کبھی اس کیفیت و حالات سے گزرنے کا تجربہ نہیں ہوا تھا۔ اس لیے غلطی ہوگئی اور وزیر موصوف کی گال سے گال لگانے کی بجائے ان کی گال پر ہونٹ رکھ دیے ۔ اس کام میں ہندوستانی سفارت خانے سے آئے دکتور لیاقت علی تجربہ کار ثابت ہوئے ۔ میں نے ان سے پوچھا کہ آپ کے ملک کا وزیر اعظم نریندر مودی بھی جھپی ڈالتا ہے، آپ نے کہیں ان سے تو نہیں سیکھا۔ انھوں نے کہا میں نے یہ سلیقہ یہاں مصر میں آ کر سیکھا ہے میں مصر میں ہندوستانی سفارت خانے میں کلچرل اتاشی ہوں ۔ مصر میں جہاں جہاں تعلیمی اور تہذیبی جمگھٹے ہوتے ہیں تو میرے سرکاری فرائض میں شامل ہے وہاں جانا اور حکومت ہند کا موٴقف پیش کرنا اور مصری عوام اور دارلحکومت سے اپنے دیش کی سمبندھنوں کو مضبوط بنانا ۔ میں نے کہا سرکاری کانفرنسوں کو جمگھٹا اچھا کہا ہے آپ نے ۔

کانفرس یا جمگھٹا

طنطا یونیورسٹی کی یہ کانفرس بھی ایک جمگھٹا ہی تھی ۔ موضوع جس قدر شاندار اور موقع و محل کے مطابق تھا منتظمین اور مندوبین اس قدر اناڑی اور بے محل و بیزار ۔ ہر مقرر کو دہشت گردی کے اسباب و عوامل ، اس سے گزرنے والی اقوام کی تکالیف اور اس عفریت سے بچاؤ کے تدابیر کو بیان کرنے کے لیے صرف پانچ منٹ دیے گئے تھے ۔ دو منٹ تو جامعہ طنطا کے ارباب واختیار و اقتدار کی قصیدہ گوئی میں گزر جاتے کہ اتنے اہم موضوع پر سیمینار رکھا ، کچھ وقت تالیوں اور باقی میں دہشت گردی پر بات ہوتی ۔

کانفرس ہال میں مسافر کے قریب دکتورہ ایمان تشریف فرما تھی ، ایمان صاحبہ کے مقالے کا

موضوع اردو افسانے پر دہشت گردی کے اثرات تھا۔ مجھے عربی نما لہجے میں کہنے لگیں کہ بہت خوف زدہ ہوں زندگی میں پہلی دفعہ کسی کانفرس میں مقالہ پڑھ رہی ہوں میرے لیے دعا کریں۔ میں نے کہا ''درود شریف پڑھیں خوف ختم ہو جائے گا'' تھوڑی دیر بعد مجھ سے کہنے لگیں ''زبردست نسخہ بتایا آپ نے، میں تو بہت بہادر ہوگئی ہوں۔'' دکتورہ مونا، دکتورہ بسنت، دکتور محمد علی کے مقالوں کے موضوعات پاکستانی سماج اور ادب پر دہشت گردی کے اثرات کا احاطہ کر رہے تھے۔ ان کے مقالوں میں اگر کسی کو انہماک سے سنا تو وہ شاید وہ میں ہی تھا باقی لوگوں کو پاکستانی مسائل اور پاکستان میں دہشت گردی سے کوئی سروکار نہ تھا۔ افغانستان، روہنگیا کے بارے میں اس کانفرس کے منتظمین اور مقررین نے کوئی لب کشائی نہیں کی۔ یہاں تک کہ مسئلہ کشمیر اور ہندوستان میں ہندوتوا کے شکار کروڑوں مسلمانوں کی حالت زار پر بھی یہ عربی منتظمین عجمی (گونگے) بنے تھے اور جو تھوڑا بہت میرے اکسانے پر بولتے بھی تو ہندوستانی حکومت کے مؤقف کے ہم خیال نظر آتے۔ مجھے یہ بات کھٹکتی کہ سعودی عرب، عرب امارات، سوڈان، نائیجیریا اور مصری مقررین کا پاکستانی مؤقف سے زیادہ ہندوستانی مؤقف کی طرف جھکاؤ کیوں ہے؟ پاکستانی تو ان اسلامی ممالک پر پڑنے والی ہر افتاد اور مصیبت میں برابر کے شریک ہوتے ہیں۔ عرب اسرائیل جنگ میں پاکستانی عوام اور حکومت نے کھل کر اسرائیل کی مخالفت کی۔ ہم اسرائیل دشمنی میں اس حد تک آگے آ گئے ہیں کہ اپنے سبز پاسپورٹ کے سرورق پر لکھا ہے کہ یہ پاسپورٹ اسرائیل کے علاوہ باقی دنیا کے سارے ممالک کے لیے کا آمد ہے۔ سابق پاکستانی وزیر خارجہ خورشید قصوری اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ ایک بین الاقوامی کانفرس میں اسرائیلی وزیر خارجہ سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے پوچھا کہ آخر پاکستانی ہم سے اس قدر بیزار کیوں ہے، ہم سے اتنی نفرت اور دوری خود عربوں کی نہیں جتنی آپ پاکستانیوں کی ہے۔

عراق، شام، اردن اور فلسطین پر پاکستانی عوام کا مؤقف اس قدر غیر متزلزل ہے کہ سرکاری

سطح پر حکومت اگر کسی کمزوری یا مصلحت کا شکار ہو جائے تو عوام سڑکوں پر نکل آتے ہیں، سڑکیں بند سرکاری املاک پائے مال، جلسے اور جلوس معمول بن جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ جمعہ کے جمعہ مساجد میں علما حکومت وقت کو متنبہ کرتے ہیں کہ عربوں کا ساتھ دو۔ ادھر مسئلہ کشمیر پر بڑے ممالک تو در کنار خود فلسطین کے مرحوم لیڈر یاسر عرفات کا یہ بیان ریکارڈ پر ہے کہ ہم کشمیر پر ہندوستان سے اختلاف نہیں کر سکتے اس سے فلسطین کی آزادی کے خلاف ہندوستانی مؤقف میں تیزی آتی ہے۔ میں نے یہ ساری صورتِ حال جامعہ الازہر کے دارالترجمہ کے پروفیسر دکتور خالد کے سامنے پیش کی تو چائے کی لمبی سِپ لیتے ہوئے مسکرا کر کہنے لگے اسلامی امہ کے حوالے سے جو کرب پاکستانی عوام رکھتے ہیں وہ کسی سے پوشیدہ نہیں مگر بین الاقوامی قرابت داری صرف رشتہ داری اور مذہب داری کی بنیاد پر نہیں ہوتی۔ ایک گھر میں تین بھائیوں میں دو بھائی ایک دوسرے سے تیسرے کے نسبت زیادہ قریب اس لیے نہیں ہوتے کہ تیسرا سگا نہیں بلکہ ان دو کے مفادات ایک دوسرے سے پورے ہوتے ہیں۔ بین الاقوامی تعلق داری میں بھی اسلامی برادری سے زیادہ کاروباری اور ذاتی مفاد کا عمل دخل ہوتا ہے۔ پاکستان بے شک ایٹمی طاقت ہے اور پاکستانی عوام کے مسلم دنیا کے لیے مخلص جذبات اور پاکستانی فوج کی پیشہ ورانہ صلاحیتوں کی مسلم دنیا معترف ہے مگر پاکستان کی سیاسی اور معاشی پسماندگی باقی دنیا سے ہم رکابی میں رکاوٹ ہے۔ لوگ اپنے آقا کے مذہب پر ہوتے ہیں۔ کسی زمانے میں پاکستان اسلامی دنیا کا آقا اور پیشرو بھی رہا ہے مگر اب ایسا نہیں، اب نہ پاکستان ہاتھی رہا اور نہ اس کے پاؤں میں سب کا پاؤں۔ متحدہ عرب امارات سے آئی پروفیسر دکتورہ امل نے ایک اور توجیہ پیش کی۔ ان کا مؤقف تھا کہ پاکستانی جس قدر محنتی، جفاکش، امانت دار اور وفادار ہوتے ہیں وہ ہم امارات والوں سے زیادہ شاید ہی دوسرے عرب جانتے ہوں مگر آپ کے ہاں بنیادی مسئلہ حکومت اور حکمرانوں کا ہوتا ہے۔ امارات میں کام کرنے والے پاکستانی محنت کش ایک خطیر زرمبادلہ اپنے ملک کو بھیجتے ہیں مگر ان کے اقامتی مسائل اور

سفری سہولیات کے حوالے سے پاکستانی سفارت خانہ کوئی خاص مدد نہیں کرتا۔ پاکستانی وزارتِ خارجہ کو دوسرے ممالک میں موجود اپنے شہریوں کا کچھ پتہ نہیں۔ایسے میں ان ممالک کو پاکستانی مسائل سے کیا لینا دینا۔دوسری اہم بات یہ کہ پاکستانی سفارت خانے میں ایسے پیشہ ور اور محبِ وطن لوگ نہیں ہوتے جیسے ہندوستانی سفارت خانے میں ہوتے ہیں۔دوسری اقوام کو اپنے مؤقف (چاہے درست ہو یا غلط) کا ہم خیال بنانے کے جوگر ہندوستانی سفارت کار آزماتے ہیں اس سے آپ کے سفارت کار نابلد اور بے خبر ہیں۔ پاکستانی سفارت کاری کسی زمانے میں بین الاقوامی معاملات میں بڑی قابلِ قدر تھی مگر اب ایسا نہیں۔دکتورہ امل کی اس گفتگو پر دکتورہ بسنت نے مہر تصدیق ثبت کرتے ہوئے کہا کہ اس کانفرس میں پاکستانی سفارت خانے سے میں نے بار بار رابطہ کیا، میں خود تین دفعہ پاکستانی سفارت خانے گئی تا کہ ان کا کوئی نمائندہ اس بین الاقوامی کانفرنس میں شریک ہو اور یوں پاکستان کی سرکاری حوالے سے نمائندگی ہو جائے مگر سفارتی عملے کو اس کانفرس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی جبکہ ہندوستان کے سفارت خانے ہم نے صرف ایک فون کال ملائی اس کے بعد ان کا نمائندہ خود بھی ہم سے رابطے میں تھا اور انھوں نے ہمیں دہشت گردی کے بارے میں ہندوستانی مؤقف پر مبنی کچھ وڈیوز اور گاندھی جی کے اہنسا اور مساواتِ انسانی پر مبنی پیغامات بھی بھیجے۔دکتورہ امل نے کہا ارے بسنت تم سے غلطی ہوئی اگر تم ان کو بتاتی کہ یہ کانفرس طنطا یونیورسٹی میں نہیں بلکہ شرم الشیخ جیسے سیاحتی علاقے میں ہے تو بہت سارے مندوبین پاکستانی سفارت خانے سے مع اہل وعیال آجاتے۔

کانفرس مجموعی طور بدنظمی کا شکار رہی۔بڑے ہال کے بجائے بغلی کمروں میں پانچ پانچ منٹ کے مقالے پیش ہوئے جس سے نہ پیش کرنے والے مطمئن تھے اور نہ سننے والوں پر کوئی اثر ہوا۔آخری دن رئیس جامعہ اور اعلیٰ انتظامی عہدہ داروں نے سٹیج پر نشست جمائی اور کانفرس کے معتمد نے دو دن کی کارگزاری انتہائی پرجوش انداز میں بیان کی۔وہی روایتی درباری جملے یونیورسٹی انتظامیہ

کی تعریفیں اور اچھی کانفرس کے انعقاد پر مبارک بادیں پہلے سے لکھے ہوئے کانفرس کے حاصلات کو پڑھا گیا اور پھر تحیا مصر کی صدائیں بلند ہوئیں۔

یہ فروری ۲۰۱۹ء کی ستائیس تاریخ تھی مانسہرہ کے خوبصورت گھنے جنگل جابہ پر ہندوستانی فضائیہ نے جو حملہ کیا تھا جس میں ایک کوا مار کر اور چند چیڑ کے درختوں کو نقصان پہنچا کر ہندستانی حکومت اور میڈیا یہ واویلا کر رہے تھے کہ جیش محمد نامی جہادی تنظیم کے مدرسے میں سینکڑوں مجاہدین قتل کر دیے گئے ۔اس حملے کے جواب میں پاکستانی ہوابازوں نے دو ہندوستانی جنگی طیارے مار گرا کر ایک ہندوستانی پائلٹ ابھی نندن کو پاکستانی حدوود سے گرفتار کر لیا تھا۔ دو ایٹمی ممالک جنگ کے دہانے پر تھے اور جنگ سے باز رکھنے کے لیے بین الاقوامی طاقتیں پچھلے دروازوں سے سفارت کاری میں مصروف تھیں ۲۵ فروری کی جابہ حملے پر خوشی کی ترجمانی لیاقت اور اس حملے سے رنجیدگی کے اثرات میرے چہرے پر عیاں تھے، جابہ اور میری یونیورسٹی کے درمیان فاصلہ ایک کلومیٹر سے بھی کم ہے اور میں دشمن فضائیہ کی گھن گرج کو ہزاروں میل دور شرم الشیخ میں محسوس کر رہا تھا۔ مگر ۲۷ فروری کو جو اس کانفرس کی بھی آخری تاریخ تھی خوشی اور رنجیدگی نے ہم دونوں کے چہروں پر باہمی تبادلہ کر لیا تھا۔ لیاقت کی کوشش تھی کہ میرے ساتھ کم ہی ملاقات ہو بالکل اسی طرح جس طرح دو دن پہلے میری کوشش تھی ۔میں شعوری طور پر پہلی صف کی اس نشست پر بیٹھ گیا جو لیاقت صاحب کی نشست کے ساتھ تھی ۔لیاقت صاحب کو ابھی نندن اور طیاروں کے گرنے سے زیادہ اپنی نوکری کی فکر تھی ۔میرے ساتھ ایک نشست میں خوشگوار موڈ میں بیٹھنا اس کی نوکری کے لیے خطرہ تھا کیونکہ وہ مسلمان تھا اور ہندوستانی ذرائع ابلاغ میری اور اس کی اٹھک بیٹھک کی تصویر وہ بھی ایک بین الاقوامی کانفرس کی جس کا موضوع دہشت گردی ہو، اگر تشہیر پا لے تو بیچارہ پھر سے دکن کے کسی پرائمری سکول میں عربی اختیاری مضمون کی پڑھائی پر تعینات ہو جائے گا ۔میں نے لیاقت سے پوچھا کہ کچھ پریشان ہو؟ جواب دیا نہیں تو۔ پریشان

کیوں ہوں گا۔بس ایک فکر لاحق ہے کہ شرم الشیخ سے قاہرہ کے لیے جس جہاز سے میں نے جانا ہے اس کے نکلنے کا وقت قریب ہے اور رئیس جامعہ کی تقریر لمبی ہو رہی ہے۔میں نے کہا فکر نہ کریں آپ کو بھی ابھی نندن والے جہاز میں پہنچا دیں گے۔بس اس کی چائے ختم ہو تو آپ بھی ساتھ ہو لینا۔کہنے لگے الطاف بھائی آپ کو اٹھکیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں۔رئیس جامعہ نے مندوبین کو مصری السیسی حکومت کی دہشت گردی کے خلاف اقدامات اور خوش حال ترقی پسند روشن خیال مصر کی نوید سنائی۔انھوں نے اس بات پر سامعین سے تالیاں بجوائیں کہ بے شک ہندوستان اور پاکستان جنگ کے دہانے پر ہیں مگر آج ہم نے دکتور الطاف یوسف زئی اور جناب لیاقت علی کو ایک نشست پر بٹھا دیا ہے تقریر کے اختتام پر کانفرنس کے منتظمین میں تعریفی اور توصیفی اسناد تقسیم کی گئیں اور جنھوں نے مقالے پڑھے تھے ان سے ہاتھ تک نہیں ملایا گیا۔ہال سے باہر لابی میں مقالہ نگار اپنی اپنی اسناد کے حصول کے لیے ایسے دست و گریباں تھے جیسے غریب ممالک کے لوگ راشن کی تقسیم کے وقت ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش میں ٹوٹ پڑتے ہیں۔جامعہ الازہر سے آئے دکتورہ رعشہ، دکتور خالد اور دکتور عبدالمجید نے رئیس جامعہ کو آڑھے ہاتھوں لیا کہ اپنی یونیورسٹی کے کلرکوں اور بابوؤں سے ہاتھ ملا کر اسناد دینے کا وقت تمھارے پاس ہے اور مصر کی دیگر یونیورسٹیوں اور باہر ممالک سے آئے پروفیسروں اور سائنسدانوں کے لیے تمھارے پاس کوئی وقت نہیں۔مسافر کو اندازہ ہوا کہ بابوؤں کی حکومت اور ان کو خوش رکھنے کی روایت نہ صرف پاکستان بلکہ ہر جگہ موجود ہے۔

رشید احمد صدیقی نے بابو مزاجی اور بابو برتاوے کے بارے میں کیا خوب بات کہی ہے کہ بابو قومیت سے آزاد ہوتا ہے۔نہ مسلم، نہ عیسائی، نہ ہندو، نہ پارسی، نہ چھوت، نہ اچھوت آفس میں مسلسل بیٹھے رہنے اور کچھ اس سبب سے کہ سارا دفتر و دفتری راز اس کے سر میں ہوتے ہیں۔جس کے بوجھ سے اس کی گردن مختصر اور توند بڑھ جاتی ہے جس کو بھرنے کے لیے اسے اوروں سے زیادہ

فکر ہوتی ہے۔اس کا معدہ اکثر کمزور ہوتا ہے۔ باتیں بہت کرتا ہے جتنا خود سمجھتا ہے اتنا اوروں کو سمجھنے نہیں دیتا۔ ہر چیز قبول کر لیتا ہے اس اصول کی بنا پر کہ کچھ آتا ہی تو ہے جاتا تو نہیں۔۔۔اس پر جتنا بھروسا ہوتا ہے دوسروں پر نہیں ہوتا۔جس طرح قانون کا اصول ہے کہ بادشاہ سے کوئی بے جا بات سرزد نہیں ہوتی اس طرح بابو سے بھی کوئی غلطی نہیں ہوتی۔ممکن ہے یہ اس وجہ سے کہ بابو کی نظر ہمیشہ غلطی کی شناخت و دریافت پر ہوتی ہے۔وہ ہر معاملہ اور ہر کاغذ اس نظر سے جانچتا ہے کہ کہیں کسی کو ناجائز فائدہ تو نہیں پہنچ رہا ہے لیکن ناجائز نقصان پہنچ رہا ہے تو وہ خیر ہے۔

اسناد کے حصول کی اس دھکم پیل میں میری نظر دکتورہ بسنت پر پڑی وہ ایک کونے میں پریشان کھڑی تھیں۔میں نے ان کے قریب جا کر مبارکباد دی کہ آپ کی یونیورسٹی نے ایک اچھے موضوع پر کانفرس منعقد کی۔مگر ان کے چہرے پر افسردگی کے ڈیرے تھے۔انھوں نے میری سند اپنی فائل سے نکال کر مجھے پیش کرتے ہوئے کہا کہ مجھے افسوس ہے کہ رئیس جامعہ نے آپ کو اپنے ہاتھوں سے سند نہیں دی۔میں نے کہا مجھے کوئی افسوس نہیں مجھے خوشی ہے کہ میں آپ کے ہاتھوں سے وصول کر رہا ہوں میری نظر میں اگر مصر سے کوئی اچھا چہرہ اور اچھا تاثر ہے تو وہ آپ ہیں آپ نے مجھے بلایا اور مہمانداری کا حق ادا کیا مجھے کوئی شکوہ نہیں کیونکہ ہم پاکستان میں بھی ایسے ہی رؤسائے جامعات کو بھگت رہے ہیں۔خوئے دلنوازی سے بے بہرہ ایسے روسا بلند نگہی، سخن کی دلنوازی اور پرسوزیٔ جاں کے قریب سے بھی نہیں گزرے ہوتے۔ان کی ریاست میں بابو با اختیار اور استاد بے دست و پا ہوتا ہے۔

عام مصریوں کی طرح دکتورہ بسنت جو ہر وقت بلند آواز کے ساتھ لہرا لہرا گفتگو کرتیں اور مخاطب کو والہانہ انداز میں اپنا مدعا بیان کرتیں آج خلاف معمول چپ چپ اور گم صم تھیں۔ بڑی مشکل سے وہ لب کشا ہوئیں تو مجھ سے کہنے لگیں میرے خاندان میں کوئی پولیس میں نہیں، کوئی فوجی افسر یا کوئی سینئر پروفیسر نہیں، کسی کے پاس کوئی سرکای عہدہ نہیں، ورنہ آج رئیس جامعہ اپنی

تقریر میں میرا بھی ذکر کرتا میں نے بھی اس کانفرس کو کامیاب بنانے میں بڑی محنت کی ہے۔ پاکستانی اور ہندوستانی ایمبیسیوں کے چکر کاٹے ہیں وہاں سے لیاقت صاحب اور پاکستان سے آپ کو بلانے کا سہرا میرے سر ہے مگر مجھے کوئی شاباشی نہیں ملی۔ بسنت سنا رہی تھی اور میں سنتا جا رہا تھا آج مجھے ایک مختلف بسنت کا سامنا تھا اپنے حق کے لیے بات کرنے والی نڈر اور معصوم بسنت۔ ان کی اس کیفیت میں ان کے چہرے پر گہری اداسی اور سوگواری کی پرچھائیں واضح تھی جوان کے حسن و جمال میں مزید اضافے کا موجب تھی۔ بالکل اس پھول آئے پیڑ کی طرح جو صحرائے سینا میں سحر کے کہر آلود اجالے میں اور بھی دلکش دکھائی دیتا ہے۔

مسجدِ صحابہ

شام سے ہماری گاڑی طریق السلام پر فراٹے بھر رہی تھی۔ شدید گرمی سے لوگوں کے چہروں کو لال کرنے والا سورج بحیرہ احمر میں ڈبکی مارنے کی تیاری کر رہا تھا۔ ساتھ والی نشست پر بیٹھی دکتورہ شائمہ سے میں نے پوچھا ہم کہاں جا رہے ہیں۔ اس نے کہا ''مسجدِ صحابہ'' بہت خوبصورت مسجد ہے۔ میں نے پوچھا کوئی پرانی مسجد ہے کہنے لگیں زیادہ پرانی نہیں مگر عمارت شاندار ہے۔ چند کلومیٹر راستہ طے کرنے کے بعد بلند میناروں والی مسجد صحابہ کے بلند و بالا گنبد و مینار اپنی عظمت کا احساس دلا رہے تھے۔ صحرائے سینا کی ریت کی مانند زرد بھوری مائل خشت اور ریختے سے بنی یہ مسجد ایک خوبصورت دلہن کی طرح سجی نظر آ رہی تھی۔ دکتورہ شائمہ کے بہ قول اس مسجد کی بنیاد ۲۰۱۱ء میں رکھی گئی۔ مگر ملکی سیاسی حالات میں اتار چڑھاؤ کی وجہ سے تعمیراتی کام تسلسل کے ساتھ جاری نہ رہا۔ اس مسجد کا نقشہ ایک مصری آرکیٹیکٹ فواد توفیق نے بنایا، نقشے کو ترتیب دیتے وقت فواد توفیق نے مصر پر حکمرانی کرنے والے تین مسلم ادوار فاطمی، مملوکی اور عثمانی کو مدِ نظر رکھا۔ مسجد کے دو طویل القامت مینار اور کئی گنبد دیکھنے والوں کی آنکھوں کو خیرہ کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے، مسجد کے صحن میں سیمنٹ اور گارے سے بنے خوبصورت پانی کے جھکے ہوئے

مٹکے جن میں لگی برقی موٹروں کے ذریعے قریبی گملوں اور کیاریوں میں موجود پودوں اور پھلوں کو سیراب کیے جانے کا دلکش منظر دیکھ کر سیاح اپنے موبائل کیمروں میں اس کی عکس بندی میں مصروف تھے۔ دکتورہ بسنت نے مجھ سے پوچھا کہ ''آپ مسجد کے اندر جائیں گے؟'' میں نے کہا جی ضرور۔ انھوں نے مجھے دکتور خالد، دکتورہ شائمہ کے ساتھ کیا، دکتورہ رعشہ بھی ہم رکاب ہو گئیں۔ ہم مسجد کے عقبی راستے سے داخل ہوئے یہ ایک تنگ مگر روشن اور ہوادار راہ داری تھی، یہ راہ داری آخر میں مسجد کے کشادہ ہال پر مختتم ہوتی ہے۔ جہاں منظر ہی بدل جاتا ہے بلا شبہ باہر سے خوبصورت نظر آنے والی مسجد اندر سے خوبصورت ترین تھی۔ دیواروں پر نقش و نگار، چوڑے ستونوں پر ایستادہ گول چھت پر قرآنی آیات اور مزین کشیدہ کاری کا کوئی جواب نہیں تھا۔ مسجد میں امامت کرنے والے اور خطیب کے لیے انگریزی اور فرانسیسی زبان سے واقفیت ضروری تھی۔ اس مسجد کا اکثر سرکاری عملہ جامعہ الازہر سے فارغ التحصیل تھا۔ ہم ابھی مسجد کے حسن میں محو تھے کہ عربی لباس میں ملبوس ایک نوجوان دکتور خالد کے پاس آیا اور سلام دعا کی، یہ امام مسجدِ صحابہ تھے اور دکتور خالد کے شاگرد۔ انھوں نے ہمیں مسجد کے اوپر دو منزلوں تک جانے کی اجازت دی جو عام سیاحوں کے لیے بند تھیں۔ دوسری اور تیسری منزل کی خوبصورتی عالی شان تھی۔ دکتورہ شائمہ نے یہاں مختلف انداز میں اپنے موبائل فون کیمرے سے ہماری عکس بندی کی۔ امام مسجد کے بہ قول مسجد صحابہ میں تین ہزار نمازیوں کی گنجائش ہے، نمازیوں کے لیے چھیاسٹھ وضو خانے بنائے گئے ہیں، اس کے علاوہ دنیا کی مختلف زبانوں کی کتابوں پر مشتمل ایک بڑا کتب خانہ بھی ہے۔ اس مسجد کی ایک اور بات بھی حیرت انگیز ہے وہ یہ کہ اس مسجد کا رقبہ 3/4 کلومیٹر ہے۔ مسافر نے مسجد کے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ امام مسجد کا دعویٰ کچھ درست لگا کیونکہ مسجد کا محیط تقریباً چھے کنال بن رہا تھا۔ مگر میناروں کی لمبائی اور 3/4 کلومیٹر کا جوڑ بن نہیں رہا تھا۔ اگر ایک کلومیٹر میں ہزار میٹر ہوں تو یہ ۷۵۰ میٹر لمبے مینار ہونے چاہئے پھر خیال آیا کہ اگر اوسطاً چار میٹر ایک منزل ہو تو ان

میناروں کی اونچائی 187.50 منزل کے برابر ہونی چاہیے۔میں نے جب اتنے منازل کے ساتھ ان میناروں کو ذہن میں ناپا تو مینار بونے نظر آنے لگے۔دکتورہ شائمہ نے کہا بس کرو امام صاحب ہمارا یہ پاکستانی دوست ابھی فیتہ لے کر ناپنا شروع کر دے گا۔میں نے کہا ہرگز نہیں آپ خواہ مخواہ مجھ سے امام صاحب کو ناراض کروا رہی ہیں۔مجھے ان کی باتوں پر یقین ہے اور میں دیکھ بھی رہا ہوں کہ واقعی اس مسجد کے مینار بلند ہیں اور اس کے جمال وجلال میں کوئی شک نہیں مگر کیا یہ مسجد بہ قول اقبال جلوہ گہ جبریلؑ بھی ہے۔دکتورہ شائمہ کو میرے سوال کی سمجھ نہیں آئی میں نے کہا کلمتہ اللہ ھی العلیا کی کوئی سعی بھی اس مسجد سے ہوگی۔انھوں نے کہا اس میں مسجد کا کیا کام یہ تو محض ایک عبادت گاہ ہے۔میں نے کہا دین اسلام کی تبلیغ وترویج میں مساجد کا بڑا کردار ہوتا ہے اس حوالے سے کسمپرسی اور لاچاری کی حالت میں چند صحابہ اور پیغمبرؐ خدا کے ہاتھوں بنی مسجد قبا سے لے کر عصر حاضر کی بڑی اور شاندار مساجد تک ایک لمبی فہرست ہے۔دکتورہ شائمہ بولی لاہور میں بھی ایک خوبصورت شاہ فیصل مسجد ہے۔میں نے تصحیح کی کہ شاہ فیصل مسجد اسلام آباد میں ہے جو سابق سعودی فرماں روا شاہ فیصل کے نام پر بنی ہے لاہور والی مسجد شاہی مسجد ہے جسے مغل بادشاہ اورنگزیب عالمگیر نے تعمیر کروائی تھی۔اس کے قریب ہی شاہی قلعہ اور مینار پاکستان ہے درمیان میں سکھوں کا گوردوارا ہے۔دکتور نجیب نے پوچھا گورود وارہ کیا ہوتا ہے۔دکتور خالد نے کہا سکھوں کی عبادت گاہ۔اس پر دکتورہ شائمہ نے چونک کر پوچھا ''Sick'' وہت دو یو مین بائی Sick'' پاکستان میں مریضوں کے لیے بھی عبادت گاہیں ہوتی ہیں۔میں نے کہا وہ بیمار نہیں ہوتے اچھے خاصے ہٹے کٹے کڑیل انسان ہوتے ہیں۔یہ ایک مذہب ہے جس کے پیروکار دنیا کے مختلف خطوں میں آباد ہیں کسی زمانے میں یہ ہندوستان کے ایک بڑے علاقے کے حکمران بھی رہے ہیں۔دکتورہ شائمہ کے پوچھنے پر مسلمانوں کے اس علاقے میں سکھ کیسے حکمران بنے مسافر کے ذہن میں مختار مسعود کا قول اُمڈ آیا جب مسجدیں بے رونق اور مدرسے بے چراغ ہو جائیں، جہاد

کی جگہ جمود اور حق کی جگہ حکایت کو جگہ مل جائے، ملک کے بجائے مفاد اور ملت کے بجائے مصلحت عزیز ہو اور جب مسلمانوں کو خوف سے موت آئے اور زندگی سے محبت ہو جائے (مسلمانوں کے دورِ زریں کی) صدیاں یوں ہی گم ہو جاتی ہیں۔

مسجد صحابہ کے چاروں اطراف میں سیاحوں کے لیے مصری تہذیب کی اشیاء اور تحائف کی خرید و فروخت کے پر رونق بازار موجود ہیں۔ مسافر کی نظر ایک دکان پر پڑی جس میں چند روسی خواتین لٹکنوں سے لٹکتی عربی عبایوں سے محظوظ ہو رہی تھیں۔ ان کے درمیان ایک مصری نوجوان دکاندار ان روسی خواتین کی نیم لباسی سے آنکھیں ٹھنڈی اور جذبات گرم کر رہا تھا۔ نوجوان کو روسی زبان آتی تھی اس وجہ سے خواتین کو خرید و فروخت میں کوئی دقت نہ تھی دکاندار سے میں نے پوچھا کہ تمھیں روسی زبان آتی ہے؟ اس نے کہا صرف مجھے ہی نہیں یہاں کے اکثر دکانداروں کو روسی زبان سے واقفیت ہے، بہت زیادہ روسی سیاح آنے کی وجہ سے یہاں کی کاروباری زبان روسی ہی ہے۔ مسافر نے دکتور خالد سے پوچھا کہ روسیوں کی یہاں زیادہ تعداد میں آمد کی کیا وجہ ہے؟ موصوف نے کہا غربت۔ میں نے چونک کر کہا غربت! وہ کیسے؟ کہنے لگے اصل میں یورپ، امریکہ اور ایشیا میں دنیا کی دوسری سیر گاہوں تک روسیوں کی رسائی اور وہاں پر قیام مشکل اور مہنگا ہے جبکہ یہاں ویزا آسان اور رہائش سستی ہے۔ دکتورہ بسنت نے کہا کہ روس والوں کے لیے شرم الشیخ کی آب و ہوا بھی موافق ہے وہاں کے ٹھنڈے پانی کی نسبت یہاں کے گرم پانی سے وہ زیادہ محظوظ ہوتے ہیں۔

خلیج نغمہ

غروب آفتاب کے بعد ہم بس میں سوار ہوئے تو رہبر نے عربی زبان میں اعلان کیا کہ اب ہم خلیج نغمہ جائیں گے۔ کچھ دیر کی مسافت کے بعد ہم خلیج نغمہ کے ایک پر رونق بازار میں تھے۔ خلیج سویز کے کنارے آباد اس خوبصورت قصبے میں عیش و نشاط کے سارے سامان میسر تھے۔ یہاں

کسینو، مساج سنٹر اور شراب خانوں کے ساتھ ساتھ ایسے متعدد ہوٹل بھی ہیں جہاں حلال خوراک اور سمندری غذاؤں پر مشتمل کھانے دستیاب ہیں۔ ہوٹلوں کے کارکن گاہکوں کو اپنی طرف راغب کرنے کے نت نئے طریقے اور سلیقے اپنائے ہوئے تھے۔ دکانیں فرعونی تہذیب سے منسلک اشیاء میں فرعونی مجسموں کی بھرمار تھی۔ قلوپطرہ اور نفرتیتی کے مجسمے کچھ زیادہ ہی تعداد میں تھے جبکہ ابوالھول کے مجسمے تو چوراہوں میں بھی لگے تھے۔ ابوالھول اور قلوپطرہ کے ناموں سے مجھے واقفیت تھی مگر نفرتیتی میرے لیے بالکل نیا نام تھا۔ دکتور محمد علی کہ نفرتیتی فرعون بادشاہ اخناتون کی بیوی تھی جو بہت حسین و جمیل اور امورِ حکمرانی کا فہم رکھنے والی خاتون تھی۔ مذہب کے حوالے سے بھی اس کی شہرت باقی فرعونی ملکاؤں سے مختلف ہے۔ اخناتون نے جب مذہب تبدیل کیا اور آمون کے خداؤں سے انکار کر کے خدائے یکتا پر ایمان کا اعلان کیا تو نفرتیتی نے بھی ان کا بھرپور ساتھ دیا۔ تاریخ نفرتیتی کی خوبصورتی کے ساتھ ساتھ اس کے ایک اور عمل سے بھی پردہ اٹھاتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ چشمِ غزال اور دلکش خدوخال رکھنے والی نفرتیتی جنسی عمل میں نت نئے انداز اپنانے کے لیے بھی شہرت رکھتی تھی۔ فرعونیات کے ماہرین کے مطابق دنیا میں ''اورل سیکس'' دہن لذتی کی ابتداء اس خاتون سے ثابت ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس کے حنوط شدہ جسم کا باقی حصہ ختم ہو گیا ہے صرف اس کا سر یورپ کے کسی عجائب گھر میں موجود ہے۔ ڈارون کے نظریہ ارتقا کے مطابق جس جگہ کا استعمال زیادہ ہو تو اس کی زندگی اور بقا زیادہ دیر تک ہوتی ہے۔ یہاں بھی نفرتیتی کے جسم کے اوپر والے حصے کی سلامتی شاید اس حصے کے استعمال کی مرہونِ منت ہے۔

خلیج نغمہ کے پر رونق بازار سے گزر کر ہم وہاں کی مقامی آبادی کی طرف گئے۔ گھروں کی دیواریں نیچی تھیں جس کی وجہ سے درونِ خانہ مکین اور کمرے صاف نظر آتے تھے۔ اکثر گھروں کی روشنیاں گل تھیں دکتور عالی نے بتایا کہ یہاں کے لوگ سحر خیز ہیں اس لیے رات کو جلدی سو جاتے ہیں تھوڑی سی مسافت کے بعد دیوہیکل سمندر نظر آیا رات کی تاریکی میں اتنے قریب سے پرشور

سمندر دیکھ کر ڈر لگنے لگا۔بستی خاموش تھی مگر سمندر پرشور اس لیے خوف میں مزید اضافہ ہوا۔سمندر کنارے ایک خوبصورت ہوٹل میں ہم نے چائے کا آرڈر دیا۔تھوڑی دیر میں بڑے بڑے پیالوں میں تھوڑی تھوڑی چائے آ گئی۔مسافر کے ہونٹوں پر چائے کی سِپ سے پہلے یہ شعر مچلا:

یہاں لباس کی قیمت ہے آدمی کی نہیں
مجھے گلاس بڑے دو شراب کم کر دو

اس شعر کے سننے سے دکتور عالی بہت محظوظ ہوئے اور دکتورہ شائمہ کو اس کا عربی ترجمہ سنایا۔میں نے کہا اس میں دودھ نہیں ہے جبکہ ہم پاکستانی دودھ والی چائے پیتے ہیں۔ ہمارے ملک میں چائے میں دودھ کی کمی بیشی ہی مہمان کی قدر و منزلت کا پیمانہ ہوتا ہے۔یعنی جس قدر چائے دودھ پتی ہوگی مہمان اس قدر زیادہ خوش ہوگا۔اس ہوٹل کے گیٹ پر لکھا تھا self service یعنی خود خدمتی۔میں نے دکتورہ شائمہ سے کہا،دودھ سے ماوریٰ شائے (مصری چائے کو شائے کہتے ہیں) کو پینا میرے لیے محال ہے البتہ آپ بنائیں تو شاید تاثیر اچھی ہو جائے اور سکون سے پی سکوں۔اس پر دکتور عالی نے پوچھا وہ کیسے میں نے کہا:

طلسم مصر ہے اس کے حسین ہاتھوں میں
جو وہ بنائے تو چائے کو جام کر دے گی

دکتورہ شائمہ جامعہ الازہر شریف میں عبرانی زبان و ادب کی استاد تھی۔شکل وصورت میں مصری خواتین سے کم مماثلت رکھتی تھی اس لیے جاذب نظر تھی۔ ہندوستانی فلموں کی ہیروئن کی طرح سانولی رنگت،چست بدن اور دلفریب اندازِ تکلم نے ان کی جاذبیت کو اور نمایاں کیا ہوا تھا۔ ہندوستانی فلموں اور پاکستانی ڈراموں کی رسیا تھی،میں نے پوچھا آپ کو اردو زبان سمجھ میں آتی ہے؟ کہنے لگیں فیلنگز (احساسات) اور ایکسپریشن سے اندازہ لگاتی ہوں۔میں انھیں ''انڈین'' کہہ کر مخاطب کرتا۔ابتدا میں وہ اس سے چڑتی تھیں مگر بعد میں اچھا لگنے لگا۔مصری

خواتین کو مشاطگی کی بڑی فکر لگی رہتی ہے۔اپنے جسم کے مختلف حصوں کو خوبصورت بنانے کا بھوت ہر عورت پر سوار رہتا ہے لیکن مصری خواتین کے اعصاب پر یہ بھوت کچھ زیادہ ہی سوار نظر آتا ہے۔ شائمہ کو یہ بیماری باقی خواتین کے مقابلہ میں کم تھی۔اس لیے منفرد نظر آتی تھی اگر کہا جائے کہ وہ مصری کی ڈلی تھی تو غلط نہ ہوگا۔

قلوپطرہ

دکتور عالی نے پوچھا کہ قلوپطرہ کو جانتے ہو۔میں نے کہا کچھ زیادہ نہیں ہاں یہ ضرور جانتا ہوں کہ وہ مصری نہیں تھی۔شائمہ نے کہا رومی تھی یا یونانی جب نیل کے پانی کا تڑکا لگا تو حسن نے نکھرنا ہی تھا۔میں نے کہا شیکسپیئر نے انتونی اور قلوپطرہ کی محبت پر ڈرامہ لکھ کر اس کو محبوب ہستی کے طور پر پیش کیا ہے۔

دکتور عالی نے کہا کہ بحیرہ روم کے کنارے آباد ایک مصری شہر ہے۔سکندر اعظم کے ساتھ قلو پطرہ کا خاندان بھی اس شہر میں آن بسا۔اس خاندان کا ایک شخص بطلیموس سکندر اعظم کی فوج میں جرنیل تھا۔سکندرِ اعظم اس جرنیل کو اس شہر کی ذمہ داری سونپ کر خود برصغیر کی طرف چل پڑا۔ بطلیموس کے خاندان نے اس شہر پر حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش تک تین سو سال حکومت کی۔قلوپطرہ کے والد جب وفات پائے اور حکمرانی بھائی کے حصے میں آئی تو اس نے بھی قلوپطرہ کے عاشقین میں اپنا نام لکھوایا اور مصری فراعین کی طرح اپنی بہن سے شادی کی، گو کہ قلوپطرہ اس شادی سے خوش نہ تھی مگر وہ بھائی سے ڈرتی تھی کہ کہیں قتل نہ کر دے۔چند سال بعد رومی بادشاہ جولیس سیزر نے مصر پر حملہ کیا اور قلوپطرہ کے بھائی کو قتل کر کے خود تخت نشین ہوتے ہی قلوپطرہ سے شادی کی۔چند سال بعد روسی جرنیل انتھونی نے مصر پر حملہ کیا، جولیس سیزر قتل ہوا اور تختِ مصر کے ساتھ ساتھ لختِ پطرہ کا بھی حکمران ٹھہرا۔دکتورہ شائمہ بولی یعنی حملہ آور آتے رہے بادشاہ بنتے رہے مرتے رہے مگر ملکہ عالیہ قلوپطرہ ہر دور میں ملکہ ہی رہی کمال کا حسن پایا ہوگا۔

دکتور علی نے کہا جی بالکل مگر صد حیف کہ علی میں ہوں اور ملکہ عالیہ کسی اور کی بنی۔ سب دوستوں نے اس پر قہقہہ بلند کیا۔ دکتور علی نے گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا کہ قلوپطرہ کا اختتام بھی اچھا نہیں ہوا جرنل انتھونی کی سابقہ بیوی جو روم کے حکمران اکتاوین کی بہن تھی کو جرنل انتھونی کی طرف سے طلاق ملنے پر خوش نہ تھا۔ اس نے مصر پر حملہ کر کے انتھونی کو قتل کر دیا۔ غم سے نڈھال انتھونی کی بیوی قلو پطرہ خود کو سانپ سے ڈسوا کر موت کی آغوش میں چلی گئی۔

تھیوڈورا

دکتور علی نے قلوپطرہ پر گفتگو سمیٹی ہی تھی کہ دکتورہ شائمہ نے ایک اور خاتون سے ہمیں متعارف کرایا۔ انھوں نے کہا چھٹی صدی عیسویں میں ایک اور مصری خاتون نے بھی تاریخ میں اپنے آپ کو امر کیا۔ یہ کوئی جدی پشتی شہزادی نہ تھی نہ ہی کسی جنگی سپہ سالار کی بیٹی بیوی یا رشتہ دار تھی اس کا آبائی مسکن مصر تھا جہاں وہ مجرے اور رقص کے ذریعے شکم کی آگ بجھاتی تھی۔ اس من چلی اور لا ابالی لڑکی کے ذہن پر نہ جانے کیا بھوت سوار ہوا کہ مصر چھوڑ کر انطالیہ پہنچی۔ اس کا یہ سفر بری تھا یا بحری اس حوالے سے تاریخ خاموش ہے مگر یہ معلوم ہے کہ اس طویل سفر میں زادِ راہ کا اہتمام جسم فروشی کے ذریعے کرتی تھی انطالیہ میں بھی اس کو پہنچتے ہی ہاتھوں ہاتھ نہیں لیا گیا نہ استقبال میں کھڑے شہریوں نے ہار پہنائے۔ اس نے ''طوائف گلی'' میں ناچنا شروع کیا تو رومی سلطنت کے امیر زادوں کو رقص اور جسم کا نیا ذائقہ چکھایا۔ ایوانِ اقتدار میں اس کی خوبصورتی اور اداؤں کے چرچے ہوئے تو شاہی محلات تک رسائی ملی اور پھر یکم اپریل ۵۶۷ عیسوی کو آیا صوفیہ نے وہ منظر بھی دیکھا کہ مصر کی حسین رقاصہ روم کے طاقتور بادشاہ جسٹینین کی بیوی بن رہی ہے اور شاہی تاج اس کے سر پر رکھا جا رہا ہے۔ تاریخ کی کتابوں میں اس مصری حسینہ کا نام تھیوڈورا ہے۔ ملکہ بننے کے بعد اس نے اپنے شوہر کو وہ مفید مشورے دیے جس سے اس کی حکمرانی پر گرفت مضبوط ہو گئی، فتوحات اور شہری اصلاحات کا سلسلہ شروع ہوا سڑکیں اور شاہراہیں بنیں اور تعلیم کے ادارے قائم ہوئے۔ کم

عمر لڑکیوں کی جنسی عمل کے لیے خرید و فروخت پر پابندی لگی ۔مصری معاشرے کی طرح رومی معاشرے میں عام خاتون کو بھی بااختیار بنایا گیا اور پدرسری نظام کو مادرسری نظام میں بدلنے کے لیے اقدامات اٹھائے گئے۔

عورت اور مصری تہذیب

قدیم مصری تہذیب میں اکثر و بیشتر بادشاہ اپنی بہن سے شادی کرتا حتیٰ کہ بیٹی سے بھی شادی رچائی جاتی تھی۔اس کے لیے تاویل یہ پیش کی جاتی کہ شاہی خون خالص رہے۔فرعونی دور کی تحریروں کو جب ڈی کوڈ کیا گیا تو معلوم ہوا کہ مصری شاعری میں لفظ بھائی بہن محبوب اور محبوبہ کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا تھا۔بادشاہوں کے حرموں میں بہنوں کے علاوہ سینکڑوں کنیزیں رکھنے کا شوق اپنی جگہ مگر متوسط آمدنی والے مصر کے عام لوگ یک زوجگی پر قانع رہتے تھے۔خانگی زندگی بدیہی طور پر بڑی حد تک بہتر تھی۔عورت کو طلاق دینا آسان نہ تھا۔عقد میں آنے والی عورت کو جائیداد میں اچھا خاصا حصہ ملتا۔ایک مغربی مفکر کا قول ہے کہ کسی بھی قدیم یا جدید تہذیب نے عورت کو وہ بلند قانونی رتبہ نہیں دیا جتنا وادیِ نیل کے باشندوں نے دیا۔اپنی تندخو (سقراطی) بیویوں کو گھر میں بند رکھنے کے عادی یونانی سیاح یہ آزادی دیکھ کر ششدر رہ جاتے۔فرعونی دور کے ادب میں عورت کی حیثیت اور عظمت کے گُن گائے جاتے تھے۔مصری عورت سے محبت ایک قومی فریضہ سمجھا جاتا تھا۔مصری مرد کو صرف مصری عورت سے ہی قلبی اور جنسی وابستگی کی ترغیب دی جاتی۔ ایک مصری بزرگ اپنے سننے والوں کو سمجھاتے ہیں کہ ’’باہر سے آنے والی ایسی عورتوں سے ہوشیار رہو۔یہ گہرے پانیوں کے بھنور کی مانند ہوتی ہیں‘‘۔اسی طرح ایک مصری اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ ’’اگر تم نے اپنا گھر کامیابی کے ساتھ سجا سنوار لیا ہے اور خوب صورت ترین بیوی تمھاری آغوش میں ہے تو اس کا پیٹ بھرو اور کمر پر کپڑا ڈالو۔اس کی خوشی کا سامان مہیا کرو کیوں کہ یہ منافع بخش کھیتی ہے۔اگر تم نے اس کا دل توڑا تو خبردار یہ سب کچھ تباہ کر دے گی‘‘۔

فرعون کے زمانے میں مصری عورت پر کوئی سماجی قدغن نہ تھی کہ مرد سے تعلق کا انداز کس طرح رکھے۔ وہ بڑی آسانی کے ساتھ جنسی معاملات کو موضوعِ بحث بناتی۔ معاشقوں میں بھی عموماً عورت شروعات کرتی۔ خود سپردگی کی صرف خواہش نہ رکھتی بلکہ کھلم کھلا اظہار پر بھی قادر تھی۔ اس کی ایک بڑی مثال زلیخا کی وہ حرکت تھی جس سے حضرت یوسفؑ بھاگتے ہیں اور راستے میں زلیخا کے شوہر ملتے ہیں اور وہ سمجھ جاتے ہیں کہ دعوتِ گناہ عورت کی طرف سے ہے۔ سوان کے اندر کوئی جوشِ مردانگی پیدا نہیں ہوتا اور نہ اس معاملے کو غیرت کا مسئلہ بناتے ہیں۔ بلکہ یوسفؑ کو کہتے ہیں بس خاموش رہو یعنی مٹی پاؤ یہ عورتیں بس ایسی ہی ہوتی ہیں۔ عصرِ حاضر کی مصری تہذیب نے بہت ساری چیزوں کو تبدیل کر دیا ہے مگر عورت ذات کو جو شخصی آزادی حاصل تھی اسے برقرار رکھا اور مصری عورت آج بھی بہت سارے فیصلوں اور معاملوں میں باقی ایفرو عرب دنیا سے زیادہ بااختیار اور باعمل ہے۔

مال مویشی، مصر و مانسہرہ

شرم الشیخ سے جبلِ موسیٰ کا زمینی فاصلہ کوئی دوسو میل ہوگا۔ سارا راستہ بے آب و گیاہ ہے۔ کہیں کہیں جھاڑی نما درخت نظر آتے ہیں جس کو مقامی زبان میں ''شنگ'' کہتے ہیں۔ راستے میں چھوٹی چھوٹی بستیاں بھی نظر آتی ہیں جن میں مکان ایک دوسرے سے بہت دور ہوتے ہیں یعنی مکانوں کے درمیان محلے اور چم کا تاثر نہیں بن رہا تھا۔ سڑک کنارے کبھی کبھی بکر والوں اور چرواہوں کی ٹولیاں سفر کرتی نظر آتیں، دکتورہ بسنت نے مجھے سے پوچھا کہ پاکستان میں بھی یہ قوم موجود ہے؟ میں نے کہا جی بالکل۔ اس نے کہا یہ بہت محنتی اور مالدار ہوتے ہیں۔ سفر کے گرد و غبار نے ان کے چہرے کو غربت زدہ بنا لیا ہوتا ہے مگر ان کی بکریاں، اونٹ اور بھیڑیں لاکھوں کروڑوں کی ہوتی ہیں۔ میں نے کہا جی بالکل پاکستانی چرواہے بھی ایسے ہی مالدار اور محنتی ہوتے ہیں، میں جب بھی ان سے ملتا ہوں ان کو اعصابی طور پر مضبوط پاتا ہوں نہ راستوں کی طوالت سے

پریشان نہ جلد منزل تک پہنچنے کی فکر نہ سفر کی صعبتوں کا گلہ اور نہ جسمانی و ذہنی تھکن کے آثار، شہری آبادیوں اور بستیوں سے گزرتے وقت جب یہ بھیڑ بکریاں ریوڑ سے الگ ہو جاتی ہیں یا کوئی بس ،ٹرک یا گاڑی والا ہارن دیتا یا کوئی بدزبانی کرتا ہے تو ان بکروالوں کو غصہ نہیں آتا، بس اپنے بے زمام ناقے کو یہ گلہ بان منہ کے ذریعے خاص سیٹیاں بجا بجا کر سوئے قطار کشیدتے چلے جاتے ہیں۔

مانسہرہ سے دریائے کنہار کے کنارے کنارے ایک سڑک ناران اور گلگت کی طرف جاتی ہے، درمیان میں عطر شیشہ کے مقام پر ایک دوراہا آتا ہے جہاں سے کشمیر مظفر آباد تک، مظفر آباد سے دریائے نیلم کے کنارے کنارے شاردہ، کیل اور تاؤ بٹ تک کئی دنوں کی پیدل مسافت یہ چرواہے اپنے مال مویشیوں کے ساتھ طے کرتے ہیں۔ مسافر بار ہا گاڑی سے اتر کر ان چرواہوں کے ساتھ دور تک پیدل چلنے کی خواہش کی تکمیل کر چکا ہے۔ آزاد کشمیر کیرن کے مقام پر جب دریائے نیلم میں طلاطم زیادہ ہو جاتا ہے تو وہ دو دشمن ملکوں کے درمیان اس تنگ گھاٹی میں خوف کی شدت بڑھ جاتی ہے اور مقامی لوگ سیاحوں کو متنبہ کرتے ہیں کہ دریا کے اس پار بھارتی مقبوضہ کشمیر ہے یہاں احتیاط کے ساتھ گزرا کریں کسی بھی وقت ہندوستانی فوج کو مستی چڑھ سکتی ہے اور بلاوجہ آپ کو گولی مار سکتے ہیں تو پیش منظر سے سرشار سیاح پس منظر سے اپنی بے خبری پر چونک اٹھتا ہے سیاح کا پسینہ رواں اور خون خشک ہو جاتا ہے۔ مگر ایسے میں یہ چرواہے خوف سے بے خبر اپنی سیٹی سے مال مویشیوں کو اور بانسری سے اپنے دل کو راہِ راست پر رکھتے ہیں۔

دھب میں ڈھابہ ہوٹل

شرم الشیخ سے پچاس میل کی مسافت پر دھب نامی قصبہ پر ہماری گاڑی چائے کے ایک ریستوران پر رکی ۔ یہاں پاکستانی ٹرک ڈرائیور ہوٹل جیسا ماحول تھا۔ گاڑی میں موجود مصری خواتین نے اپنے بڑے بڑے پرس کھولے تو مجھے حیرت ہوئی کہ ان پرسوں میں تو شۂ خوراک یعنی پنیر، ڈبل روٹی بسکٹ، سیب، مالٹے، کھجور اور پانی کی بوتل تک سارا انتظام مکمل تھا۔ مجھے اس انتظام

وانصرام سے زیادہ خواتین کی فیاضی نے بہت متاثر کیا۔سب نے ایک دوسرے کے ساتھ اپنے توشے شریک کیے، باوجود اس کے کہ سب کے پاس یہی چیزیں خود بھی موجود تھیں۔سوڈان کے دکتور یحیٰ اور میرے پاس ان اشیاء میں سے کوئی چیز نہ تھی۔اس لیے سب نے ہمیں نوازنا شروع کر دیا اور آخر میں ہم دونوں کے پاس خوراک کا ذخیرہ ان سے بھی زیادہ ہو گیا۔میں نے دکتورہ بسنت کو کہا کہ پاکستانی خواتین کے پرس اس سے بھی بڑے ہوتے ہیں مگر وہ پاؤڈر، کریم سے لیس ہوتے ہیں۔اس نے ہنس کر کہا وہ چیزیں ہمارے پاس بھی ہوتی ہیں مگر الگ پرس میں۔ہوٹل میں مختلف قسم کے بسکٹ کے ساتھ نفیس پیکنگ میں ایک چیز بند تھی، میں نے اس کے بارے میں دکتورہ شائمہ سے پوچھا کہ یہ کیا ہے؟ انھوں نے کہا ''خشک روٹی'' میں پوچھا یہ بھی یہاں فروخت ہوتی ہے۔اس نے بڑے اعتماد سے کہا کہ ہاں بالکل اور لوگ یہاں اس کو بڑے شوق سے کھاتے ہیں۔ہوٹل کے عقب میں بیری کے دو تین درخت تھے جن پر پھل پک چکے تھے، میں نے توڑ کر کھائے تو محسوس ہوا کہ تپتے صحرا نے ان کو پکانے اور رات کی چاندنی نے ان کو میٹھا بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔دکتورہ شائمہ کی مجھ پر نظر پڑی تو باقی دوستوں کو مخاطب کرتے ہوئے چیخ اٹھیں: لاحظو!لاحظو!، قد وجد الطاف شجرۃ النسبق ۔۔۔دیکھو دیکھو، الطاف کو بیری کا درخت مل گیا ۔کہنے لگیں تم نے یہ زبردست چیز ڈھونڈی ہے اس کو عربی میں نبق کہتے ہیں، میرا قد آپ سے کم ہے میرے لیے بھی توڑو۔میں نے بیری سے لدی ایک شاخ اس کی طرف جھکائی اس نے پنجوں کے بل کھڑے ہو کر بیر توڑے اور سارے دوستوں میں تقسیم کیے۔تپتے صحرا میں زرق لباس میں ملبوس دکتورہ شائمہ جب شام سمے پنجوں کے بل بیری توڑنے کے لیے نیم جھکی ٹہنی سے جوئے کہستاں کی طرح، بہ قول اقبال اچکتی، سرکتی، اچھلتی اور سنبھلتی تو یہ منظر نہ صرف پہاڑوں کے سل بلکہ جوانوں کے دل توڑنے کا موجب بن رہا تھا۔

سینٹ کیتھرائن

دھب سے طویل مسافت کے بعد ہم سینٹ کھترائن پہنچے۔ دکتور یحیٰ نے مجھ سے پوچھا کہ تمھیں اس علاقے کے بارے میں جانکاری ہے؟ میں نے کہا، مجھے نہیں معلوم، اس نے کہا بہت اہم مقام ہے، یہاں جبلِ موسیٰ ہے جہاں حضرتِ موسیٰؑ اور ربِ کریم ہم کلام ہوئے تھے۔ یہاں حضرت موسیٰؑ کو آگ دکھائی گئی اور پیغمبری دلوائی گئی۔ سبزے اور ہریالی سے بے خبر اس تنگ گھاٹی میں نہتے، بے بس اور جنگی سامان سے ماورا اپنی قوم کو چین و امن اور آرام کی زندگی کے متلاشی موسیٰؑ کو خداوندِ کریم حکم دیتے ہیں کہ (اذہب الافرعون انہ طغیٰ) فرعون کی طرف جاؤ، بہت سرکش ہوگیا ہے۔

میں تحیر اور وجد کی کیفیت میں تھا، مجھے اپنے آپ کو بار بار یہ یقین دلانا پڑ رہا تھا کہ میں واقعی اس مقام پر کھڑا تھا جہاں تجلیات الٰہی کا ظہور ہوا تھا۔ میرے لیے یہ مقام مانوس بھی تھا اور اجنبی بھی، میں یہاں پہلی دفعہ آیا تھا مگر یوں لگ رہا تھا جیسے میں یہاں کے کونے کونے سے واقف ہوں قرآنی آیات کی عملی نشانیاں میری آنکھوں کے سامنے تھیں میں بچپن سے مطالعہ قرآن کی وجہ سے اس علاقے اور یہاں ظہور پذیر ہونے والے واقعات سے باخبر تھا مگر آج بانظر ہوگیا، پہلے ایک عام انسان تھا مگر آج اس نظارے نے خاص بنا دیا۔ سینا کی گرمی میں مجھے سردی سی محسوس ہو رہی تھی ،میری جسمانی حالت میری روحانی حالت کے ساتھ ایک کیفیت میں رہنے اور ساتھ دینے سے عاری تھی۔ دکتور یحیٰ نے پوچھا کیف الحال یا اخی؟ میں نے کہا قرآن کی بہت ساری آیات کا بصری مطالعہ کر رہا ہوں، جن کا متحمل میرا گناہ گار اور ناتواں جسم ہو نہیں سکتا اس لیے کچھ کپکپی سی طاری ہوگئی ہے۔

میں نے دکتورہ شائمہ سے پوچھا کہ حیرت ہے اتنے بڑے برگزیدہ پیغمبروں کی سرزمین کا نام سینٹ کیتھرائن کے نام سے کیسے رکھا گیا۔ شائمہ نے پوچھا تم کو معلوم ہے سینٹ کیتھرائن کون تھی؟ میں نے نفی میں سر ہلایا۔ وہ بولی ایک سادھو خاتون تھیں جو بازنطینی حکمرانوں کی عیسائیت

کے خلاف مہم جوئی اور عیسائیوں کی سرکوبی سے بننے والی خوف اور تشدد کی فضا سے بھاگ کر یہاں مقیم ہوئیں۔

اس کی دیکھا دیکھی باقی لوگ بھی ان ہی تنگ گھاٹیوں کی طرف ہجرت کر آئے۔ اسی کے نام سے اس علاقے کا نام سینٹ کیتھرائن رکھا گیا۔ دکتور یحیٰ نے سینٹ کیتھرائن میں موجود ایک خانقاہ کی طرف اشارہ کر کے کہا اس خانقاہ کی تاریخی حیثیت بھی نرالی ہے۔ ظہور اسلام کے بعد جب ساری خانقاہیں ختم کر دی گئیں یا مساجد میں منتقل کر دی گئیں تو اس خانقاہ کو اس لیے ختم نہیں کیا گیا کہ اس کے نہ گرانے کی ضمانت ایک خط کے ذریعے نبی آخر الزماں حضرت محمدؐ نے دی تھی۔

سطح سمندر سے سات ہزار پانچ سو فٹ بلندی پر واقع ''طور'' پہاڑوں سے مختلف ہے۔ اس کی شکل اور اس کے پتھروں کو دیکھ کر اس بوڑھے بابا کو یاد کرنے لگا جو ہمارے گاؤں کے محلوں میں گھر گھر سرمہ بیچا کرتا تھا۔ یہ سرمہ وہ چارسدہ کے ایک قصبے دلدار گڑھی سے لاتا تھا۔ اس کے بہ قول یہ سرمہ ''کوہِ طور'' سے لائے گئے ایک خاص پتھر کو کوٹ کر تیار کیا جاتا ہے۔ بابے کے اس دعوے میں حقیقت کتنی تھی خدا معلوم، مگر جبلِ موسیٰؑ کا پتھر واقعی کچھ سرمہ نما تھا۔ اس پہاڑ کی تقدیس تین آسمانی مذاہب یہودیت، عیسائیت اور اسلام میں مسلمہ ہے۔ ابتدائی عیسوی دور میں اس پہاڑ پر صرف مذہبی اکابرین کو چڑھنے کی اجازت تھی اور وہ بھی ننگے پاؤں۔ جبلِ موسیٰؑ پر چڑھنے کی ابتدا ہارون پہاڑی سے شروع ہوتی ہے۔ یہاں حضرت ہارونؑ کی یاد میں عیسائی گرجا اور ایک مسجد بنی ہے۔ یہودیوں کے پیغمبر ہارونؑ کی یاد میں گرجا اور مسجد کی صورت میں عیسائیت، یہودیت اور اسلام کی ہم آہنگی کا ایک حیران کن مظہر نظروں کے سامنے تھا۔ یہ وہی وادیٔ مقدس ہے جہاں سامری نے بنی اسرائیل کی عبادت کے لیے اس وقت سونے کا بچھڑا بنایا جب حضرت موسیٰؑ اللہ تعالیٰ کی عبادت اور ان سے محوِ کلام ہونے جبلِ موسیٰؑ پر موجود تھے۔ وہ جگہ اس علاقے سے تقریباً سات کلومیٹر دور اوپر پہاڑ کی طرف ہے جہاں پیدل پہنچنے کے لیے آٹھ سے دس گھنٹے درکار ہوتے

ہیں ۔مسافر کے ذہن میں سورہ طٰہٰ کی آیتیں تیرنے لگیں ۔ یہاں سے موسیٰ ؑ دیدارِ خداوندی کے لیے جب روانہ ہوئے تھے تو ملاقات والی جگہ پر وقت سے پہلے پہنچ گئے تھے ۔موسیٰ ؑ کی جگہ کوئی بھی بشر ہوتا یہی کرتا ،محبوب سے ملاقات ہو تو عاشق کا دوڑے دوڑے جانا تو بنتا ہے ’’تو میرا شوق دیکھ میرا انتظار دیکھ‘‘ ۔مگر اللہ تعالیٰ جب موسیٰ کو احساس دلاتے ہیں کہ تم سے غلطی ہوگئی ، وقت کی پابندی باقی قرینوں سے مقدم ہے ،تم کو پہلے نہیں آنا چاہیے تھا ،تمھارے پیچھے سامری نے یہودیوں کو بچھڑے کی عبادت پر لگا دیا ہے ۔حضرت موسیٰؑ واپس آئے اور حکم دیا کہ اپنے اپنے قبیلے کے مرتد شدہ اور سامری کے جھانسے میں آئے ہوؤں کو دین موسوی پر ایمان رکھنے والے اہلِ ایمان قتل کر دیں ۔تاریخ کی کتابوں میں رقم ہے کہ تقریباً ستر ہزار یہودی اس میدان میں قتل ہوئے ۔

میں نے دکتور یحیٰ سے پوچھا کہ کیا اب بھی لوگ پیدل جاتے ہیں تو انھوں نے کہا کہ نہیں وہ جسمانی طاقت اور پختگی اب لوگوں میں کہاں اب لوگ اونٹ وغیرہ کی سواری لیتے ہیں ۔اوپر چڑھ کر جبل مناجات بھی واضح نظر آتا ہے جہاں حضرت شعیبؑ کی رہائش تھی ۔ یہاں حضرت موسیٰؑ کا دس سال تک قیام رہا اور پھر حضرت شعیبؑ کی صاحبزادی سے عقد ہوا ۔

شرم الشیخ سے قاہرہ واپسی

دس بارہ گھنٹے کی طویل مسافت کے بعد شرم الشیخ سے قاہرہ پہنچے ۔کانفرس کے مندوبین مختلف مقامات پر بس سے اترتے گئے ۔دکتور مجید ،دکتورہ رعشہ ،دکتورہ شائمہ ، دکتور یحیٰ ایک ساتھ اترے ۔دکتورہ مونا جو الازہر یونیورسٹی میں اردو کی استاد ہیں جنھوں نے ڈاکٹر مبارک علی کی کتاب پاکستانی معاشرے میں گھٹن اور خواتین کے استحصال پر اپنا مقالہ پڑھا تھا ،جس پر سوال و جواب کے سیشن میں میری طرف سے شدید تنقیدی گفتگو ہوئی تھی اور کانفرس کے باقی ایام میں وہ مجھ سے کنی کتراتی تھیں ، نے بھی آج بس سے اترتے ہوئے چہرے پر خفیف سی مسکراہٹ لا کر آواز دی ’’اللہ حافظ یا دکتور الطاف‘‘ دکتورہ بسنت کا گھر بھی ہماری رہائش سے پہلے آیا ،انھوں نے

مجھے دکتور محمود کے حوالے کیا اور خود اگلے دن شام کو ملنے کا وعدہ کر کے بس سے اتر گئیں ۔دکتورہ ایمان کو لینے ان کے بھائی وقت پر نہ پہنچ سکے تو ہمارے ساتھ ٹیکسی میں سوار ہو گئیں ۔ایمان کا گھر عسکری فلیٹس میں تھا جہاں قدرے خوشحال لوگ رہتے تھے، میں نے پوچھا کہ آپ کے شوہر فوج میں ہیں؟ اس نے کہا نہیں وہ سعودی عرب میں ملازمت کر رہے ہیں ۔باقی عربوں کی نسبت مصری زیادہ ہنر منداور جفاکش ہوتے ہیں ۔ان کا المیہ یہ ہے کہ دورِ فراعنہ سے لے کر عصرِ حاضر تک مطلق العنانی اور مارشل لائی طرز حکمرانی نے حاکموں کو مالداراور عام مصریوں کو غریب تر بنا دیا ہے۔

قدیم وجدید قاہرہ

مسافر دکتور محمود کے ساتھ قاہرہ کے تنگ ،تاریک اور دھول مٹی سے اٹے بازار میں چہل قدمی کر رہا تھا ۔دکتور محمود نے کہا یہ قاہرہ قدیم ہے میں نے کہا اور غریب بھی اس نے مسکراتے ہوئے کہا غریب بھی اور فقیر بھی بہت ہے ۔میں نے کہا فقر بہت بڑی نعمت ہے ۔دکتور محمود بولے ہاں مگر اس نعمت کے ثمرات قاہرہ جدید والے سمیٹ رہے ہیں ۔یہ فقیر لوگ رات دن محنت کر کے بڑی مشکل سے دو وقت کی روٹی حاصل کرتے ہیں مگر ان کے نوالے قاہرہ جدید کے باسیوں کے منہ میں چلے جاتے ہیں ۔رعایا قدیم میں جبکہ حکمران طبقہ جدید میں قیام پذیر ہے۔

مصریوں کی پسندیدہ خوراک پُول ہے ۔بغیر مرچ مصالحوں کے حلیم کی طرح دکھائی دینے والی اس خوراک میں چھوٹے سائز کا لوبیا ڈالا جاتا ہے ۔ساتھ میں سلاد، جو پلیٹ کی بجائے چھوٹے کاسے میں پیش کیا جاتا اس کے اندر تھوڑا سا پانی بھی ہوتا ہے ۔سلاد اور پول روٹی کے ساتھ تناول کرنے کے بعد سلاد کا بچ جانے والا پانی زیادہ خوش ذائقہ ہوتا ہے ۔دکتور محمود نے مشورہ دیا کہ رہ جانے والا پانی پیا کرو اس کی لذت پول سے بھی زیادہ ہوتی ہے، میں نے کہا ایک یونانی کہاوت ہے کہ کسی بھی تخلیق کار کا فن پارہ سو سال سے زیادہ عوامی پذیرائی حاصل نہیں کر پاتا اگر وہ صرف پانی پیتا ہو۔ یہ جو مصر میں فنونِ لطیفہ، رقص اور مجسمہ تراشی کے خوبصورت نمونے تخلیق

ہوئے ہیں اس کے پیچھے بھی اس سلا دی پانی اور پول کا ہاتھ تو نہیں؟۔ کہنے لگے آپ کو نہیں معلوم مصری بہت کچھ پیتے ہیں میں نے پوچھا مثلاً؟ کہنے لگے جیسے شیشہ، چلم، تمبا کو اور اس کے علاوہ بھی بہت کچھ۔ مصر میں چلم نوشی کی دکانیں بھی پول کے ٹھیلوں کی طرح جگہ جگہ پائی جاتی ہیں۔ جہاں چھوٹے بڑے، بوڑھے با جماعت چلم نوشی و دخانی کرتے رہتے ہیں۔ عجب بات یہ ہے کہ اس کو مصر میں سماجی برائی نہیں سمجھا جاتا۔ لوگ دکانوں کے اندر دکانوں کے سامنے چلم کشیدتے ہیں اور دل کا بوجھ ہلکا کرتے ہیں۔ شیشہ پینے والوں میں خواتین کی بھی بڑی تعداد شامل ہوتی ہے۔ مسافر نے اس بارے میں دکتور محمود سے استفسار کیا تو انھوں نے کہا ہاں شیشہ پینا مرد و زن کے لیے معیوب بات نہیں ہمارے معاشرے نے اسے قبول کر لیا ہے۔ ہمیں اس سے کوئی سماجی فرق نہیں پڑتا۔ مسافر کو دکتور محمود کی صاف گوئی اور سچ گوئی اچھی لگی۔ انھوں نے اپنے معاشرے میں کیے جانے والے کام پر جھوٹ موٹ کا پردہ نہیں ڈالا۔

ہم مزلقاً ارض للواً جنرل بس سٹینڈ سے ایک مزدے میں بیٹھ کر قاہرہ یونیورسٹی کے قریب اترے۔ محمود نے حسرت سے یونیورسٹی کی طرف دیکھ کر کہا کاش یہاں مجھے نوکری مل جائے، یہ میری آئیڈل یونیورسٹی ہے۔ یہاں سائنسی علوم کے ساتھ ساتھ فنون کی تعلیم بھی دی جاتی ہے۔ دکتور محمود نے سیکیورٹی گارڈ سے اجازت لے کر یونیورسٹی گیٹ سے اندر جا کر مجھے آواز دی کہ تم بھی آ جاؤ۔ یہاں ہم اسلامی فنِ تعمیر کے ایک عمدہ نمونے یعنی یونیورسٹی کی مرکزی عمارت کو پس منظر میں رکھ کر عکس بندی کی۔ یونیورسٹی سے کچھ فاصلے پر حدیقۃ الحیوان کے سامنے مرکزی شاہرہ پر ایک بڑے چوراہے میں ابوالہول کا دیوہیکل مجسمہ نصب تھا۔ اس کے ساتھ ایک خاتون کا مجسمہ بھی تھا، ابوالہول نے خاتون کے سر پر سایۂ عاطفت کیا ہوا تھا۔ مسافر کو ابوالہول کی یہ حرکت معنی خیز لگی۔ میں نے وضاحت طلب کی تو دکتور محمود بولے آپ کو یہاں اکثر جگہوں پر ابوالہول کے مجسمے لگے نظر آئیں گے۔ ہمارے ہاں ابوالہول کو مصر کی حفاظت کا دیوتا سمجھا جاتا ہے۔ میں نے پوچھا

اورعورت۔۔۔؟اس نے کہاعورت خودمصر ہے یعنی مصر پرابوالہول کا سایہ ہے۔ یہ جوابوالہول کے پنجوں کے بل بیٹھنے کا انداز ہے اس سے مراد یہ ہے کہ یہ ہر وقت چست و تیار بیٹھا ہوتا ہے مصر کی حفاظت میں، میں نے دکتور محمود سے پوچھا کہ آپ کو معلوم ہے کہ ابوالہول سے ایک نسبت امریکہ کی مجسمہ آزادی کی بھی ہے۔محمود چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ لا کر کہنے لگا کیسی نسبت جوڑتے ہیں آپ دکتور الطاف۔کہاں ہزاروں سال کی تاریخ کا امین ابوالہول اور کہاں ڈیڑھ صدی سے بھی کم عمر کا مجسمہ۔میں نے کہا آپ کی بات درست ہے مگر شاید آپ کو معلوم نہیں اس مجسمے کو بنانے والے فرانسیسی مجسمہ ساز بارتھولدی جب ۱۸۵۵ء میں مصر آیا تو ابوالہول کو دیکھ کر متاثر ہوا اور سوچا کہ ایسی ہی یادگار اور ان مٹ نشانی اُسے بھی بنانی چاہیے۔ان دنوں نہر سویز کے ذریعے مشرق و مغرب کو ملانے کی باتیں گردش میں تھیں اور یہ منصوبہ بنایا جا رہا تھا کہ بحری جہاز مغرب سے براستہ سویز کنال بحر احمر کے راستے مشرق کی جانب سفر کرے۔ان جہازوں کو سوئے قطار رکھنے کے لیے اطلاعی مینار کی ضرورت محسوس ہوئی تو بارتھولدی نے اپنا منصوبہ مصری حکمران اسماعیل پاشا کے سامنے پیش کیا۔بارتھولدی نے اس مینار کا نام ''مصر مشرق کے لیے روشنی کا مینار'' رکھا اور مشورہ دیا کہ اس کو نہر سویز کے جنوبی داخلی راستے پر نصب کیا جائے۔مجسمہ بناتے وقت تھولدی کے ذہن میں یہ بات تھی کہ مصری تہذیب کی زندہ علامت عورت ہی ہوسکتی ہے۔انھوں نے اس مجسمہ مینار کا نقشہ ایک ایسی مصری کسان لڑکی کے روپ میں تیار کیا جس نے سکارف پہنا ہوا تھا اور ہاتھ میں مشعل تھی۔دکتور محمود بولے تو پھر یہ مجسمہ امریکہ کیسے پہنچا۔میں نے کہا آپ کے بادشاہ ابتدا میں راضی تھے مگر بعد میں اس منصوبے کی لاگت کا سن کر دست بردار ہو گئے بعد میں جب امریکہ کی آزادی اور انقلاب کی صد سالہ تقریبات کا انعقاد امریکہ نے کیا تو فرانسیسی دانشوروں نے امریکہ کو اس موقع پر تحفہ دینے کی خواہش ظاہر کی۔بارتھولدی نے اسی مجسمہ آزادی میں تھوڑی تبدیلی کی ہاتھ میں مشعل کی جگہ کتاب پکڑائی مصری دہقانی لڑکی کا لباس اتار کر یونانی لڑکی کا لباس پہنایا۔پیر میں

ٹوٹی ہوئی زنجیر کو ظلم سے نجات جبکہ سر پر تاج کے سات کونے بنا کر سات براعظموں اور سات سمندروں کی یونانی کہاوت علامت کے طور پر پیش کیا۔

مصر، معیشت اور مطلق العنانیت

میں اور دکتور محمود قاہرہ یونیورسٹی سے کبری الجامعہ کی طرف گامزن تھے کہ سڑک کے کنارے ایک ادھیڑ عمر کا آدمی دیکھا جس کا چہرہ غربت اور معاشی بدحالی کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ موصوف سڑک پر جھاڑو لگا رہا تھا اور بہت سارا کچرا اس کے ناتواں ہاتھوں سے زیادہ کمزور تیلی دار جھاڑو سے اس طرح واپس نکل رہا تھا جس طرح ارنسٹ ہمینگوے کے ناول ''اولڈ مین اینڈ سی'' کے مرکزی کردار مچھیرے کے سمندر میں پھینکے ہوئے جال سے نکلتا ہوا پانی۔ میں نے دکتور محمود کو کہا تمھاری حکومت اس آدمی کو جتنی تنخواہ دے رہی ہے اس میں ایسے ہی کام کی گنجائش نکلتی ہے۔ مصر کی معاشی حالت اور یہاں کے مزدور کی اوقات کی تلخی کو مدِ نظر رکھ کر میں نے پوچھا کہ تمھارے حکمران بھی تو ساٹھ عشرے میں اشتراکی تھے، جواب دیا جی بالکل۔ اس نے کہا روس سے مراسم ہی کی وجہ سے یہاں پر پین عرب ازم اور مصری تہذیب کو زیادہ اجاگر کیا جاتا رہا ہے۔ میں نے کہا شاید اس لیے یہاں کے چوراہوں پر ابوالہول براجمان ہے اور پوری مصری قوم اس آس پر بیٹھی ہے کہ پنجوں پر کھڑا ابوالہول ایک نہ ایک دن اٹھے گا اور مصر ترقی کی شاہرہ پر گامزن ہوگا اور صرف یہ نہیں بلکہ مصریوں کے بیٹوں کو قتل کرنے والے رعمسیس کے نام پر ایک بڑی شاہرہ اور چوک کے نام بھی قاہرہ شہر میں رکھے گئے۔ دکتور محمود مصر کے سیاسی حالات سے گفتگو کو موڑتے ہوئے مجھ سے پوچھتے ہیں کہ اشتراکیوں کی زندگی کیسے گزرتی ہے۔ میں نے کہا آئیڈیل کی تلاش میں گھٹ گھٹ کر۔ میں نے بات پھر مصر کی طرف موڑ دی، آپ کی سرزمین اشتراکیت کے لیے زیادہ ہموار ہے کیونکہ یہاں ہزاروں سال سے مطلق العنانیت ہے دوسری بات یہ کہ مصری نوجوان تعلیم یافتہ بھی ہیں، پرجوش اور اولوالعزم بھی ساتھ ساتھ ہنرمند اور جفاکش بھی ہیں۔ ایسے ماحول میں

اگر شہریوں کو بنیادی انسانی حقوق نہ ملیں تو اشتراکی بیج کو فصل بننے میں دیر نہیں لگتی مگر یہ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ ابھی مصر اس عفریت سے محفوظ ہے۔اس نے پوچھا اشتراکیت میں اختیار کس کے پاس ہوتا ہے میں نے کہا اسی بااختیار ٹولے کے پاس جو ہر جگہ برسر اقتدار ہوتا ہے، یعنی وہی خچر نئی زین کے ساتھ۔اس حوالے سے ''جنت کی تلاش'' ناول میں رحیم گل نے بڑے پتے کی بات کہی ہے کہ آپ دنیا کے مصروف ترین انسان اس وقت بن جاتے ہیں جب آپ اپنی حکومت کا تختہ الٹ کر اشتراکی حکومت کی داغ بیل ڈال دیتے ہیں۔آپ مشین کے پرزے کی طرح کام کرتے ہیں اور جیسا کہ پرزے میں کوئی امنگ نہیں ہوتی اس طرح فرد کا سینہ بھی خواہشوں سے خالی ہو چکا ہوتا ہے۔دکتور محمود مصر میں بے روزگار نوجوانوں کے تاریک مستقبل سے خوف زدہ ہو کر کہنے لگے مگر یہاں تو ایسا نہیں، ہمارے معاشرے میں جینے کی امنگ بھی ہے اور روشن مستقبل کے لیے دوڑ دھوپ بھی۔میں نے کہا اسی لیے میں نے شکر ادا کیا کہ مصری معاشرہ مردہ نہیں زندہ ہے اور خدائے زندہ زندوں کا خدا ہے۔

دریائے نیل

ہم قاہرہ یونیورسٹی اور حدیقۃ الحیوان سے پیدل کبری الجامعہ پہنچے جس کے نیچے دریائے نیل رواں دواں تھا۔میں نے یہاں اس پانی میں ٹھہراؤ اور بردباری محسوس کی نیل اپنے ہزاروں میل کے بہاؤ کا اظہار چیخ چیخ کر نہیں کر رہا تھا۔ہم نے تین مصری جنین کے دو ٹکٹ لیے اور لانچ میں بیٹھ گئے۔لانچ کی خستہ حالی بھی مصری عوام کی معیشت کی طرح زبوں حال اور ناتواں تھی۔لانچ میں بیٹھتے ہی مجھے دکتورہ شائمہ کی بات یاد آئی۔انہوں نے کہا تھا کہ ایک مصری کہاوت ہے کہ جو بندہ دریائے نیل کا پانی پی لے وہ دوبارہ مصر ضرور آتا ہے۔میں نے چلتی لانچ سے ہاتھ دریا میں ڈالا اور اوک بھر پانی پیا۔لانچ کی ایک کھڑکی میں سبز رنگ کی بوتل نظر آئی میں نے بوتل کو نیل کے پانی میں خوب دھویا اور اس کو دریا کے پانی سے بھرا، دکتور محمود بولے اس کا کیا کرو گے میں نے کہا

یہ سبز رنگ کی بوتل ہے اور پاکستان کا سرکاری رنگ سبز ہے میں اس سبز رنگ کے ساتھ نیل کا اشتراک چاہتا ہوں میری خواہش ہے کہ مصر اور پاکستان ایک دوسرے کے قریب ہوں، اس پانی اور بوتل کی طرح۔ میں نے دکتور محمود سے پوچھا نیل کا پانی کہاں سے نکلتا ہے اس نے کہاں سوڈان میں کوئی دور جگہ ہے۔ میں نے پوچھا وہاں کونسا گلیشیئر ہوسکتا ہے جہاں سے یہ پانی آتا ہے کہنے لگے افریقہ میں گلیشیئر نہیں ہوتے یہ کوئی پاکستان تو نہیں، پھر کہنے لگے کوئی دو جھیلیں ہیں وہاں سے یہ پانی آتا ہے۔ اس حوالے سے میں معلوماتی کتب سے رجوع کیا تو معلوم ہوا کہ ہم جسے ایک دریائے نیل سمجھ رہے ہیں دراصل یہ دو دریاؤں نیل ارزق اور نیل ابیض کا مجموعہ ہے۔ نیل ارزق اپنی طوالت کے باعث لمبے بہاؤ کا موجب بنتا ہے تو نیل ابیض میں پانی کی بہتات میں زمینوں کے لیے ذرخیزی کا سامان ہے۔ ابیض افریقہ کی مہان جھیلوں کے مرکزی جنوبی روانڈا سے ہوتا ہوا تنزانیہ یوگنڈا کو پار کر کے سوڈان میں قدم رنجہ فرماتا ہے اور ارزق ایتھوپیہ کی جھیل سے جنوب مشرق کی طرف رختِ سفر باندھے مشکل پہاڑی سلسلوں اور کئی ڈھلوانوں سے گزرتا ہوا سوڈان میں خرطوم کے قریب نیل ابیض سے بغل گیر ہو جاتا ہے۔ سوڈانی حکومت نے اپنی زمینوں اور پانی کو ترسے عوام کی پیاس نیل سے بجھائی یا نہیں اس کا جواب کسی سوڈانی باشندے کی شکل دیکھ کر تلاش کیا جا سکتا ہے مگر مصری بادشاہ جمال عبدالناصر نے اسوان کے مقام پر ۱۹۷۰ء میں نیل پر بند باندھ کر مصری عوام کو ایک بڑا تحفہ دیا۔ پانچ ہزار دو سو پچاس مربع کلومیٹر پر مشتمل اس ڈیم میں دس کڑور ستر لاکھ کیوسک پانی جمع کرنے کی گنجائش ہے۔ اس ڈیم کا کچھ حصہ سوڈان میں ہے جس کو جھیل نوبیہ کہا جاتا ہے جس کا زیادہ حصہ مصر میں واقع ہے۔ یوگنڈا اور ایتھوپیا کی جھیلوں سے نکلنے والا ارزق اور ابیض گیارہ ممالک کے تقریباً چالیس کروڑ انسانوں اور اس سے زیادہ چرندوں اور پرندوں کی آبی ضروریات پوری کرنے کے لیے ساڑھے چھے ہزار کلومیٹر کا سفر طے کر کے اسکندریہ کے قریب بحیرہ روم سے جا ملتا ہے۔

دریائے نیل جب سوڈان میں داخل ہوتا ہے تو اس کی رفتار سست پڑ جاتی ہے اور اس کو قریب قریب سات سو کلو میٹر دلدلی زمین سے واسطہ پڑتا ہے۔اس دلدلی زمین پر اگی گھاس پاپائرس نیل کو دبوچ لیتی ہے۔حیرت کی بات یہ ہے کہ یہاں نیل نظر نہیں آتا اور تاحدِ نگاہ پاپائرس کی وہ گھاس نظر آتی ہے جس کی ٹہنی پر ہاتھی کھڑا ہو تو ہاتھی گرنے سے رہا۔افریقہ میں اس کے راستے میں کئی جنگلات آتے ہیں۔جس میں ہاتھی ،شیر،گینڈے جنگلی بھینسیں ،ہرن ،دریائی گھوڑے اور مگر مچھ کثیر تعداد میں پائے جاتے ہیں۔پرندوں کی ہزار اقسام اور حشرات الارض کی بے شمار قسمیں اس کے علاوہ ہیں۔

لانچ دریائے نیل میں فراٹے بھر رہی تھی اور میں نیل کی بے کراں وسعتوں کو اپنے تخیل میں سمیٹنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا دکتور محمود نے مجھے تاریخ اور تخیل کی خوابیدگی سے بیدار کیا کہنے لگے دریائے کے کنارے یہ چھوٹی بڑی لانچ دکھائی دے رہے ہیں؟ میں نے اثبات میں سر ہلایا تو کہنے لگے دراصل یہ ہوٹل ہیں جہاں سیاح آ کر ٹھہرتے ہیں۔''بہت مہنگے ہوتے ہیں''(مصری عربی میں ج کو گ اور گ کو ج کی جگہ بولا جاتا ہے) دکتور محمود کے چہرے سے پرتعیش زندگی کے حصول کی حسرت ٹپک رہی تھی وہ اس وقت اس بے بس پنچھی کی طرح نظر آ رہا تھا جو اچھے مستقبل کے لیے اڑان بھرنا چاہتا ہے مگر دوسرے مصری ہنر مند نوجوانوں کی طرح اس کی مشیت اور معیشت کسی اور کے قبضے میں تھی وہ بہت کچھ کرنا چاہتا ہے مگر بیچارہ کیا کر سکتا ہے جیب خالی ،شہر خالی، جام خالی،سفرہ خالی،ساغر و پیمانہ خالی۔

ان رہائشی لانچوں کے ساتھ قاہرہ ٹاور اپنے ہونے کا احساس دلا رہا تھا۔اس کی طویل قامتی دیدنی تھی ساتھ میں بہت سارے ملکی اور بین الاقوامی اداروں کے دفاتر اور مصری ٹیلی ویژن کی عمارت نمایاں طور پر نظر آ رہے تھے۔نیل کے گرد اتنے مہنگے دفاتر اور یہاں پر غیر ملکی سیاحوں کے لیے لانچوں میں بنی اقامت گاہوں پر دکتور محمود نظرِ حسرت ڈال رہے تھے۔میں ان

کی حسرتوں کا مزید قتلِ عام نہیں دیکھ سکتا تھا۔ میں نے موضوع بدلنے کے لیے کہانی چھیڑ لی، پوچھا دریائے نیل میں جب سیلاب آتا تو بہت تباہی مچاتا مگر اس دریا میں پانی کی کمی بھی خشک سالی اور بربادی کی نشانی بنتی اس لیے جب اس کا پانی کم پڑتا تو اس میں روانی اور پانی پیدا کرنے کے لیے کسی خوش شکل کنواری ناری کو پھینک دیا جاتا۔ اس طریقے سے نیل خوش ہو جاتا اور پانی و روانی کو جاودانی ملتی۔ کہنے لگے جی بالکل درست۔ میں نے کہا یار کس قدر مظلوم تھے اس زمانے کے لوگ کہ لڑکے فرعون قتل کرواتا اور خوش شکل لڑکیاں نیل ہڑپ کر جاتا۔ آنکھوں میں چمک اور چہرے پر شریر مسکراہٹ لا کر کہنے لگے مگر دیکھو پھر بھی نہ لڑکوں کی کمی رہی اور نہ خوبصورت ناریوں کی۔ میں نے کہا تم نے ناریوں کے ساتھ خوبصورت کا لفظ لگایا مگر مجھے تو مصری مرد زیادہ خوبصورت، وجیہہ اور جاذب نظر لگے۔ بلاشبہ مصری عورت خوش قسمت ہے جس کو اتنے خوبصورت اور ملنسار مرد ملے۔ میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا کہ مزے کی بات یہ ہے کہ لڑکوں کے قتلِ عام سے فرعون کو موسیٰؑ نے روکا تو لڑکیوں کے قتل عام سے حضرت عمرؓ نے جن کو فاتح مصر عمرو ابن العاص نے لڑکیوں کو نیل کی روانی کے لیے دریا میں پھینکنے کی رسم کی اطلاع دی تو حضرت عمرؓ نے دریائے نیل کے نام خط لکھا کہ تم اگر اپنی مرضی سے بہہ رہے ہو تب تمھاری مرضی اور اگر اللہ تعالیٰ واحد و قہار تمہیں جاری رکھتا ہے تو ہم اللہ تعالی سے دعا گو ہیں کہ وہ تجھے رواں رکھے۔ خط کی پرچی امیر عسکر نے نیل میں پھینکی اور اگلے ہی دن دریائے نیل میں وہ روانی آئی کہ خشک سالی تر سالی میں بدل گئی۔ دکتور محمود نے کہا واقعی ان دو بڑی شخصیات کی عظمت اور ہم مصریوں پر ان کے احسانات کسی سے پوشیدہ نہیں اور تا قیامت ممنون رہیں گے۔

نیل کنارے دو دل ہارے

مصری نوجوان ان دو شخصیات کے ممنون ہوں نہ ہوں دریائے نیل کی ممنونیت سے انکار نہیں کر سکتے۔ دریا کے کنارے سرکار نے بیٹھنے کے لیے خوبصورت اور آرام دہ جگہ بنائی ہے یہاں

نیل کی تازہ ہوا کے جھونکے کی سرمستی میں یہ نوجوان لڑکے اور لڑکیاں ایک دوسری سے محبت کی پینگیں بڑھاتے ہیں۔مصر میں مرد وزن کے اختلاط پر کوئی سرکاری یا سماجی پابندی نہیں عورت اپنی زندگی کا ساتھی بڑے اعتماد کے ساتھ نا صرف چن سکتی ہے بلکہ اس کا اظہا بھی برملا کرتی ہے۔ میرے خیال میں شاید ہی کسی دوسرے مسلم ملک میں عورت کو یہ اختیار حاصل ہو جو مصری عورت کو حاصل ہے۔دریائے نیل کے کنارے جوان جوڑوں کی بیٹھک دریا کے حسن میں اضافے کا موجب بنتی ہے۔مصری لڑکیاں جدید مغربی لباس کے اوپر خوش رنگ کوٹ زیب تن کر کے اور سر پر دوپٹے کی جگہ سکارف پہنے انتہائی جاذبِ نظر دکھاتی دیتی ہیں۔تھوڑے تھوڑے فاصلے پر بیٹھے ان جوڑوں کے درمیان سوڈان اور دوسرے غریب افریقی ممالک کی خواتین گھومتی نظر آتی ہیں جو ہاتھوں میں خوش رنگ گلدستے لیے ان محبّ اور محبوب کی خوش گپیوں میں مخل ہو کر رنگ میں بھنگ ڈال کر مطالبہ کرتی ہیں کہ ہم سے پھول خرید کر اپنے دوست کو پیش کرے۔میں نے سوڈانی خاتون سے پوچھا کہ دن میں کتنے گلدستے فروخت کرتی ہو، بولی دن اچھا ہو تو سو جنین کے پھول نکل جاتے ہیں میں نے دکتور محمود سے پوچھا کہ آپ نے کبھی کسی کے ساتھ نیل کے کنارے پر لطف وقت بتایا ہے، بولے ہائے میرے نصیب میری غربت اس راہ میں بڑی رکاوٹ ہے۔میں نے پوچھا اس پر لطف وقت کے لیے کونسی امارت ضروری ہے۔بس دوست بناؤ کنارے بیٹھو جنین کے پھول خرید کر دو، مسکراتے ہوئے کہنے لگے، الطاف صاحب آپ بھی بادشاہ ہو محبوب پیسے کے بغیر ساتھ نہیں بیٹھتا۔مصری نوجوان نسل کا بڑا مسئلہ معیشت ہے اور ہم نے شادی کو معیشت سے منسلک کیا ہے۔جس کے پاس پیسہ ہوگا وہی پر لطف زندگی گزار سکے گا اور جو میری طرح کنگال ہوگا اس کے پاس محبوبہ آنے سے رہی۔میں نے اس خوش پوش نوجوان کے اندر خوش مزاج اور خوش بصیرت انسان کو مزید تلاشنا چاہا تو ان سے کہا کہ خلیل جبران تو کہتا ہے کہ ہر نوجوان کی زندگی میں کوئی انسان ضرور آتا ہے جو شباب کی رات میں اچانک ہی کسی موڑ سے نمودار ہو جاتا ہے اور

اس کی تنہائیوں میں پیار کی ایک ہلچل سی مچا دیتا ہے اور اس کی خاموش بے کیف راتیں پیار کے مدھ بھرے نغموں سے گونجنے لگتی ہیں۔ دکتور محمود خلیل جبران کے لہجے میں اور عجیب طنزیہ اور مزاحیہ پیرائے میں کہنے لگے۔ اے میرے عہدِ غربت کے رفیق۔۔۔ میرا محبت کا زمانہ گزر چکا۔ میرے حسین خواب توریزہ ریزہ ہو کر بکھر چکے ہیں۔ اب تو صرف کربناک یادیں باقی ہیں جو غیر مرئی پروں کی طرح میرے اردگرد پھڑ پھڑاتی ہیں اور آنسو بن کر میری آنکھوں سے ٹپکتی رہتی ہیں۔ دکتور محمود کے اس جبرانی انداز نے مجھے بہت محظوظ کیا اور ہم دونوں کے قہقہوں سے بہت سارے جوڑوں کی توجہ ہماری طرف ہوگئی۔

التحریر چوک

کبری الجامعہ کے علاوہ قاہرہ میں دریائے نیل پر ایک پل اور بھی ہے جس کو ۱۲ اکتوبر پل کہا جاتا ہے۔ مسافر دکتور محمود سے وجہ تسمیہ پوچھی تو اس نے کہا عرب اسرائیل جنگ کی یاد میں یہ پل بنایا گیا ہے۔ اس پل کے کنارے قاہرہ ٹاور ہے جس کی بلندی نے باقی عمارتوں کو ماند کر رکھا ہے۔ ڈوبتے سورج کی سرمئی روشنی میں قاہرہ کے مینار کی نکھری رنگت نقرئی نظر آنے لگی جس نے اس کی وجاہت اور قد کاٹھ میں بڑھوتری پیدا کر دی تھی۔

۱۲ اکتوبر پل کے دوسرے کنارے ''التحریر'' کے نام سے ایک بڑا چوک ہے۔ اس نام سے میری شناسائی چند سال پہلے اس وقت ہوئی جب سابقہ مصری صدر حسنِ مبارک کے طویل دور حکومت کے خلاف ایک تحریک شروع ہوئی۔ تحریک جب احتجاج میں بدلی تو مرکزی حیثیت التحریر چوک کو ملی جہاں مصری نوجوانوں نے کئی ہفتوں تک دھرنا دیا اور آخر کار حسن مبارک نے پہلے حکومت چھوڑی اور پھر جیل جانا پڑا۔ سیاست کے ماہرین نے اس تحریک کو ''عرب بہار'' کا حصہ گردانا جو عرب ملکوں میں مطلق العنان بادشاہوں کے خلاف شروع ہوئی تھی۔ بیسوی صدی کی ساتویں دہائی کے اواخر میں ''مرگ برشاہ'' اور ''شاہ رفت'' کی جو آوزیں تہران کی مرکزی

شاہراہوں اور چوکوں میں سنی گئی تھیں۔عرب بادشاہوں کو بھی مطلق العنانی کے خلاف ایسی ہی آوازوں کا سامنا کرنا پڑا۔اس میں کوئی مبالغہ نہیں کہ انقلاب خواہ کتنا ہی پرانا کیوں نہ ہو جائے اس کی داستان ہمیشہ تازہ رہتی ہے۔امید اور عمل، بیداری اور خودشناسی، جنوں اور لہو کی داستان بھی کبھی پرانی ہوسکتی ہے؟ زمانہ اس کو بار بار دہراتا ہے فرق صرف نام، مقام اور وقت کا ہوتا ہے۔

از انقلاب زمانہ عجب مدار کہ چرخ
ازیں فسانہ و افسوں ہزار دار دیار

میں انقلاب کے اس تخیلاتی جلوؤں کے کچوکے دل و دماغ میں محسوس کرتا ہوا اپنے چہار سو بے خبر عرب اسرئیل جنگ کے یادگار پل سے اچھا خاصا راستہ طے کر چکا تھا کہ دکتور محمود نے میرا دھیان اپنی طرف کرتے ہوئے کہا۔۔۔آپ التحریر چوک میں کھڑے ہیں۔۔۔مسافر کو دکتور محمود کی تخیل میں رخنہ اندازی کچھ اچھی نہیں لگی مسافر کچھ دیر اور انقلابی تخیل میں رہنا چاہتا تھا۔

تحریر چوک بھی فیصل آباد کے گھنٹہ گھر کی طرح کئی بغلی شاہراہوں کا مرکز ہے۔درمیان میں فلک بوس لوہے کے پلر کے ساتھ ٹیک لگا کر چوک کے چاروں طرف سے آنے والی کشادہ شاہراہوں پر نظر ڈالی اور دکتور محمود سے پوچھا کہ عرب بہار کے وہ نوجوان اب کہاں ہوں گے کیونکہ انقلاب کی کلیاں پھول بنی ہی نہیں تھیں، صرف گھوڑے پر زین کی تبدیلی ہوئی اور سب کچھ ختم ہوگیا۔دکتور محمود جواب سے کنی کترانے لگے۔ان کے چہرے پر خوف اور لاعلمی کے آثار واضح تھے لڑکھڑاتی زبان سے مجھے کہنے لگے ملکی سیاست پر کوئی دسترس نہیں، مجھے نہیں معلوم وہ لڑکے کون تھے اور اس انقلاب کے پیچھے کون سے عوامل کارفرما تھے۔میں نے پیچھا نہیں چھوڑا مزید پوچھا۔۔۔آپ تو اس کے چشم دید گواہ ہیں۔جواب دیا میرا علاقہ قاہرہ سے دور ہے مجھے کچھ بھی نہیں معلوم کیا ہوا۔اس کی دھڑکنیں تیز اور غیر متوازن تھیں وقت کے جبر اور فرعون کے دیس میں مجھ جیسوں کے چبھتے سوال کسی بھی مصری کی دھڑکنوں کے توازن کو متزلزل کر سکتے ہیں۔ان کی

لڑکھڑاتی زبان مجھے سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی کہ ''یہاں تو بات کرنے کو ترستی ہے زباں میری'' میں نے ایک اور داؤ کھیلا پوچھا میڈیا خصوصاً مغربی میڈیا میں تو اس کا بہت چرچا تھا۔ وہ ہونٹوں پر خفیف مسکراہٹ لا کر بولے میں میڈیا نہیں دیکھتا اور مغربی میڈیا تو بالکل بھی نہیں میں نے کہا اچھا ہی کرتے ہیں جو نہیں دیکھتے۔ آپ کے ہی ایک مصری صحافی محمد حسنین نے زبردست بات کہی ہے کہ مغرب عالمی ذرائع ابلاغ پر اتنی کامل دسترس رکھتا ہے کہ وہ جب چاہے تیسری دنیا کے کسی بھی لیڈر کو سارے جہاں میں بدنام کرنے کی مہم چلا کر پنجرے میں بند پرندے کی طرح بے بس کر دے اور چاہے تو کسی بھی لیڈر کو خواہ کتنا ہی نکما کیوں نہ ہو اتنا عظیم و بے مثال اور ایسا نابغۂ عصر بنا کر پیش کر دے کہ ہم سا ہو تو سامنے لاؤ والی بات ہو جائے۔

حدیقۃ العجائب

التحریر چوک کے ایک حصے میں ایک بڑی اور عالی شان عمارت ایستادہ تھی میں نے دکتور محمود سے پوچھا یہ کیا ہے بولے ھذا حدیقۃ العجائب۔ عجائب گھر پر نگاہ ڈالی تو مسافر کے دل میں تحریر چوک کی قدر و منزلت سوا ہو گئی جہاں عصرِ حاضر کے مصری نوجوان بہتر مستقبل کے لیے عصری فرعونوں سے نبرد آزما ہوتے ہیں اور ماضی کے فرعونوں کو بہ طور عبرت اپنی آغوش میں جگہ دی ہے۔ عجائب گھر میں داخلے کے لیے ٹکٹ لینا ضروری تھا۔ مسافر کو اہلِ فراعنہ کی لاشوں اور لکی ایرانی سرکس کے جانوروں میں کوئی فرق محسوس نہ ہوا سچ کہا میرے رب نے ''اب تو ہم صرف تیری لاش بچائیں گے تاکہ تو بعد کی نسلوں کے لیے نشانِ عبرت بنے''۔

غیر ملکیوں کے لیے یہ ٹکٹ تین سو مصری پاؤنڈ کا تھا مصریوں کے لیے ایک سو پچاس جبکہ مصری طالب علموں کے لیے ساٹھ مصری پاؤنڈ۔ دکتور محمود نے کوئی جگاڑ لگایا اور ہم بغیر ٹکٹ کے اندر داخل ہو گئے عجائب گھر کی مرکزی عمارت کے سامنے ایک بہت بڑے دالان میں کچھ ٹوٹے ہوئے اور خراب مجسمے رکھے گئے تھے، ان کے درمیان میں پیادہ روشیں بنائی گئی تھیں یہ تمام پیادہ

روشیں عجائب گھر کی مرکزی عمارت تک جا کر ایک بڑے رستے کی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔ یہاں سے ہم سیڑھیاں چڑھے تو ایک خودکار مشین کے ذریعے تلاشی بھی لی گئی۔ صدر دروازے سے گزر کر ہم ایک بڑے ہال میں داخل ہوئے۔ جہاں اہل فراعنہ کے کئی میٹر طویل مجسمے اس انداز میں رکھے گئے تھے جیسے ان کا دربار لگا ہو اور امورِ سلطنت پر اجلاس جاری ہو۔ میں نے ایک قوی ہیکل فرعونی مجسمے کے قریب جا کر دکتور محمود کو کہا کہ اس کے ساتھ میری تصویر بناؤ انھوں نے کہا یہ امنونس سوم ہے اور ساتھ میں ان کی ملکہ اور تین بیٹیاں ہیں۔ امنونس کے چہرے سے دہشت اور ظلم کے آثار ٹپک رہے تھے۔ امنونس کے سامنے ایک کشتی تھی جس کی لمبائی پچاس ساٹھ فٹ تھی۔ یہ بادشاہ خوفو کی کشتی تھی۔ مرکزی ہال سے جڑے بغلی کمرے بھی کمرے کم اور ہال زیادہ دکھتے تھے۔ یہاں بھی مصری فراعین کے مجسمے محفوظ تھے۔ اس کے علاوہ یونانی بادشاہوں اور اکابرین کے مجسمے بھی بڑی تعداد میں رکھے گئے تھے۔ ایک ہال میں پتھر، لکڑی اور دوسری دھاتوں سے بنے تابوتوں کا ایک جہان آباد تھا، عجائب گھر کی دوسری اور تیسری منزل میں حنوط شدہ لاشوں سے منسلک اشیاء طلائی مٹکے، کمر بند، بازو بند کے ساتھ ساتھ چاندی کے برتن، کرسیاں، میزیں، چھوٹی بڑی کشتیاں، چادر، کپڑے، جوتے، چپل (سونے، لوہے اور چمڑے سے بنے) دستانے، موزے غرض انسانی ضروریات کی ساری چیزیں، سقارہ اور الاقصر کے شاہی قبرستانوں سے نکالی گئی تھیں جو یہاں نمائش کے لیے رکھ دی گئی تھیں۔ دوسری منزل کے مرکزی برآمدے میں میاں بیوی فراعین یویا اور تویا کی لاشیں رکھی گئیں تھیں جن کے سر کے بال اور ناک ہونٹوں کے کنارے آج بھی سلامت تھے۔ صرف شوہر صاحب کے دائیں پاؤں کی بڑی انگلی سے ایک دو انچ کے برابر گوشت اتر چکا تھا۔ عام مصری اور فراعین میں عموماً طویل القامت ہوتے ہیں جبکہ یویا اور تویا کے قد زیادہ طویل نہ تھے۔ دونوں میاں بیوی قد کاٹھ میں برابر تھے۔

عجائب گھر کی دوسری منزل سے منسلک ایک کشادہ بغلی راہداری تھی جو ایک کشادہ برآمدے

سے منسلک تھی۔ یہاں بہت ساری گوریوں اور مشرقِ بعید خصوصاً جاپانی سیاحوں نے قطار بنائی ہوئی تھی، ساتھ ہی ایک اور ٹکٹ گھر تھا جہاں مشہور اور بڑے فراعین کی حنوط شدہ لاشیں رکھی گئیں تھیں۔ٹکٹ گھر کے ساتھ آویزاں معلوماتی تختی پر ان کے نام درج تھے۔سعن عال دوم، آمن ہوتب، توتھموسس اول، دوم، سوم اور پنجم کے ساتھ ساتھ آمن ہوتب دوم، موسیٰؑ کی اپنے گھر میں پرورش کرنے والے رعمیسس دوم اس کے والد میت سیتی اول، رعمیسس کے بیٹے منفتاح وغیرہ۔۔۔میں نے دکتور محمود سے پوچھا ان کو الگ کیوں رکھا گیا ہے کہنے لگے ان کے مظالم زیادہ تھے، زندگی گزارنے کا ڈھنگ اچھوتا تھا، پوری مصری اور افریقی تہذیب میں انہی کے نام کا ڈھنڈورہ پیٹا جاتا تھا۔جس فرعون نے اہلِ مصر سے اولادِ نرینہ کے جینے کا حق چھینا اسی کے گھر میں اللہ تعالیٰ نے موسیٰ کی پرورش کا اہتمام کیا۔تاریخ کی کتابوں میں اس کی وجاہت اور بہادری کے تذکرے ملتے ہیں۔جنگ اور محبت میں اس نے جیت کے جھنڈے گاڑے مصر کے خزانوں کو سونے سے لبریز کیا۔یہودیوں کی مقدس سرزمین فلسطین کو تین سال کے اندر اندر اپنی بادشاہت میں شامل کیا اور وہاں سے بہت سارے یہودی بہ طور غلام لے آئے، اپنی جنگی اور انتظامی فتوحات کو شعرا اور گویوں سے لکھوا کہلوا کر ان رزمیہ نظموں اور قصیدوں کو شاہی مقبروں اور چوراہوں پر کندا کروایا اور اس کے بدلے میں خود کو کئی سو بیویوں کا انعام دیا۔سو بیٹوں اور بچاس بیٹیوں کو والد رعمیسس دوم نے خوش شکل بیٹیوں کو بھی نہیں بخشا اور بیٹیوں سے جنی اولاد نے چار سو سال تک فرعونیت کو دوام بخشا۔

دکتور محمود سے میں نے پوچھا کہ یویا اور تویا کو بڑے فرعونوں کی بیٹھک سے باہر کیوں رکھا گیا ہے کیا یہ کم برے تھے۔انھوں نے کہا فرعون کم برے نہیں ہوتے ہاں کم شہرت والے ہو سکتے ہیں مگر مخلوق خدا کو اذیت دینے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے۔ایسے ہی ایک غیر مقبول بادشاہ اور اس کی والدہ کی کہانی ایک کتاب میں، میں نے پڑھی تھی جو ایک گمراہ کن ماحول کے پروردہ تھے۔دونوں اکثر جوا کھیلتے، کھیل بہت آسان تھا اور لمحہ بھر میں ختم ہو جاتا تھا۔ایک پانسا تھا جس پر ایک سے لے

کر چھے تک ہند سے لکھے ہوئے تھے۔ایک نمبر بادشاہ لیتا اور ایک نمبر اس کی والدہ، پانسا پھینکا جاتا ۔اگر دونوں نمبر نہیں آتے تو کھیل برابر۔ بادشاہ کا نمبر نکل آتا تو والدہ شرط میں لگی رقم ادا کرتی اور والدہ جیت جاتی تو سعادت مند بیٹا شرط میں لگا ہوا غلام ہار جاتا۔ جسے محترمہ جیت کی خوشی میں شوقیہ ذبح کرتی۔ ماں بیٹے کے آدھ گھنٹے کے کھیل کے نتیجے میں سو پچاس غلام بے وجہ مارے جاتے۔

رعمیسس دوم

دکتور محمود رعمیسس دوم کی دولت کی جمع آوری سے زیادہ پیسے کے بہاؤ کے قائل تھے۔جس طرح مغل بادشاہوں نے برصغیر کا پیسہ برصغیر ہی میں عبادت گاہیں، سرائے اور فلاحی عمارتیں قائم کر کے لگایا بالکل اسی طرح رعمیسس دوم نے پرشکوہ عمارات اور بڑے بڑے ہال بنوائے، اقصور کے معبد خانے کو وسعت دی۔ دریائے نیل کے کنارے پر بڑا مقبرہ تعمیر کرایا، ابوسمبل میں عظیم اور سنگین عبادت گاہ قائم کی اور پوری ریاست میں اپنے دیو قامت مجسمے راستوں اور چوراہوں کی زینت بنوائے۔ دورانِ گفتگو دکتور محمود نے ایک قوی ہیکل مجسمے کے پاؤں کی چھوٹی انگلی پر ہاتھ رکھا اور کہنے لگے یہ مجسمہ بھی انہی میں سے ایک ہے۔ محمود کی پوری ہتھیلی اس چھوٹی انگلی پر ایک چھوٹے نشان کے برابر دکھ رہی تھی۔

معروف تاریخ دان ہیرڈوٹس رعمیسس دوم اور اس کے بیٹے منفتاح کی طاقت اور قوت کا تخمینہ اور ان کے زوال کے اسباب گنواتے ہوئے لکھتے ہیں کہ مصر میں صرف ایک انسانی قوت نے ان دونوں فراعین پر فوقیت حاصل کی اور وہ قوت تھی مذہبی طبقہ۔ تاریخ میں کسی بھی دوسری جگہ کی طرح یہاں بھی ریاست اور مذہبی اکابرین کے درمیان اختیارات اور دولت کے حصول کی نہ ختم ہونے والی رسہ کشی جاری رہی جنگوں اور مفتوحہ علاقوں سے وصول شدہ مالِ غنیمت اور جزیوں کا کثیر حصہ معبدوں اور پروہتوں کو ملتا۔

رعمیسس دوم کے زمانے تک طاقت اور دولت کی فروانی اوجِ کمال کو پہنچی۔ اس زمانے

میں ان کے غلاموں کی تعداد ایک لاکھ ستر ہزار کے لگ بھگ تھی جو اس وقت مصری آبادی کا تیسواں حصہ بنتا تھا۔ساڑھے سات لاکھ ایکڑ زرعی زمین اور پانچ لاکھ گائیں ان کی ملکیت میں تھیں۔اس کے علاوہ مصر اور شام میں ایک سو ستر دیہات سے جزیہ وصول کیا جاتا تھا۔معبد کے رکھوالوں سے لوگ اس قدر خوف زدہ تھے کہ ہر سال مصری کاشتکاروں سے وصول کردہ بیس ہزار بوریاں گندم اور مکئی ان کی شکم پروری کے لیے دیتے۔اس کے علاوہ دس کلوگرام سونے اور چاندی کے زیورات اور بیش قیمت تحفے مذہب کے پجاریوں پر نچھاور کیے جاتے تھے۔میں نے دکتور محمود کو مخاطب ہو کر کہا کہ مذہب اور اقتدار کا سانجھ کوئی نئی بات نہیں ابتدائے افرینش سے تا حال اقتدار سے چمٹے خاندان اور مذہبی پیشوا ایک ہی ڈراما رچا رہے ہیں کہ ہم ایک دوسرے کی ضد ہیں مگر دراصل ایک کی بقا دوسرے کے وجود سے جڑی ہے۔ان کا آپس میں گٹھ جوڑ اور ایک دوسرے کی اعانت باقی مخلوق کے لیے پرانی روش ہے۔موروثی بادشاہوں کے محلات کی تعمیر اگر غربا کے خون پسینے اور جسم سے عبارت ہیں تو کاہن اور پیشوا اطاعت گزار مریدوں اور جان لیواؤں سے اپنی گدی کو دوام بخشتا ہے۔بادشاہ اور حکمران طبقہ مزدوروں اور محنت کشوں کے منہ سے نوالہ چھینتا ہے تو مذہبی پیشوا عاقبت سنواری کے جھانسے دے کر اس کا رہا سہا غلہ بھی نوچ لیتا۔بس طریقۂ واردات مختلف ہے،حاصلات یکساں ہیں۔ایک قانون کی پیروی اور دوسرا خالق کی اطاعت کا خوف بہ طور ہتھیار استعمال کرتا ہے۔اور عوام بیچاری ان ہتھیاروں کے مقابلے کی سکت کب رکھ سکتی ہے بس پس جاتی ہے۔میں نے دکتور محمود سے پوچھا کہ منفتاح اور پروہتوں کا گٹھ جوڑ اس قدر تھا کہ منفتاح ان جادوگروں کی طاقت کے بھروسے اور ذریعے حضرت موسیٰ اور ان کو حاصل الوہی طاقت کا توڑ ڈھونڈا کرتا۔وہ بولے جی بالکل مگر عصائے موسیٰؑ اور یدِ بیضا کے واقعات اس بات کی دلیل ہیں کہ وہ سارے جادوگر ان کے سامنے سرنگوں ہوئے ظاہر ہے الوہی طاقت کا مقابلہ ان پرہتوں کے بس کی بات نہ تھی میں نے کہا اور کیا خوبصورتی ہے اس حکم خداوندی میں (اذھب الا فرعون

انہ طغی) معصوم مولے کو ظالم شہباز سے لڑانے کے واقعات ہر زمانے میں پیش آئے ہیں۔

عجائب گھر کی تیسری منزل میں مختلف مجسموں کے ساتھ ایک ہی شکل کے مانوس مجسمے چھوٹے بڑے سائز میں نصب تھے۔ میں نے دیکھتے ہی کہا یہ سامری کا بچھڑا ہے نا۔؟ محمود نے اثبات میں سر ہلایا۔ مسافر کی آنکھوں کے سامنے سورۃ البقرہ کی آیات کی پٹی چلنے لگی موسیٰؑ ۔۔۔جبلِ موسیٰ ۔۔۔ چالیس دن ۔۔۔ ہارونؑ ۔۔۔ آلِ یعقوبؑ ۔۔۔ سامری سنار ۔۔۔ بچھڑے کا بت ۔۔۔ موسیٰؑ کی واپسی ۔۔۔ ہارونؑ کا غصہ ۔۔۔ داڑھی سے پکڑنا اور پھر اللہ کی طرف سے آلِ یعقوب پر عذاب۔

قدیم مصری عقاید اور جانور

اس وقت مصریوں کا عقیدہ تھا کہ ابتدا سے آخر تک آسمان اور دریائے نیل ہی باقی بچ جانے والی سماوی مخلوق ہے۔ یہ تمام حیرت انگیز اجرامِ فلکی محض اجرام نہیں بلکہ طاقتور روحوں اور ایسے دیوتاؤں کی ظاہری صورتیں ہیں جن کے ارادے ہمیشہ یکساں نہیں، یہ پیچیدہ اور مختلف تحریکوں کا حکم جاری کرتے رہتے ہیں۔ آسمان بذاتِ خود ایک گنبد ہے جس کی وسعت کے پار عظیم گائے حت جور دیوی کھڑی ہے۔ زمین اس کے پیروں تلے تھی اور پیٹ پر دس ہزار ستاروں کا ملمع، ایک مصری عقیدہ یہ بھی تھا کہ آسمان دیوتا سبو تھا ابیوت دیوی یعنی زمین کے اوپر دھیرے سے لیٹا ہے اور ان کی عظیم الجثہ مباشرت سے تمام چیزوں نے جنم لیا۔

دکتور محمود نے سامری کے بچھڑے والے بت پر ہاتھ رکھ کر کہا دکتور الطاف فرعونی ادوار میں جانور دیوتا زیادہ مقبول تھے مصریوں کے عبادت خانے ،سانڈ،مگر مچھ ، باز، گائے، ہنس ، بکرے، بلی، مینڈھے، کتے ،مرغی ،ابابیل ،گیدڑ ،سانپ کی نسلوں سے بھرے پڑے تھے۔ میں نے کہا ہندوؤں اور مصریوں کے حوالے سے عقیدۂ تقدیس قریب قریب ہے۔ اس نے کہاں ہاں بہت مشابہت ہے۔ مگر مصری فرعون کے زمانے میں جانوروں سے جنسی اختلاط کے قائل تھے اور یہ عمل صرف مردوں کے لیے روا نہ تھا بلکہ خوبصورت عورتیں مقدس بکروں کے ساتھ مجامعت کی خاطر

پیش کی جاتی تھیں۔ بکرا اور سانڈ تخلیقی جنسی قوت کا نمائندہ تھا۔ ہندو عورتوں کی طرح مصری عورتیں بھی ان جانوروں کے اعضا کی ننگی شبیہیں مخصوص تہواروں میں اٹھاتیں اور ان سے رغبت اور محبت کا اظہار کرتیں۔

عجائب گھر میں ملکی اوور غیر ملکی سیاحوں کے جتھوں کے جتھے داخل ہو رہے تھے۔ مصری گائیڈ عربی لہجے میں رواں انگریزی میں فرعونوں کے مجسموں اور ان کی اشیائے ضرورت پر غیر ملکی سیاحوں کو معلومات بہم پہنچانے اور زیب داستان کے لیے بہت ساری چیزوں کے بارے میں مبالغے سے کام لیتے۔ جگہ جگہ مصری سکول اور کالجوں کی بچیاں اور بچے مختلف مجسموں کے گرد ڈیرے ڈالے ڈرائنگ بورڈوں اور تختیوں پر سادہ رنگین پنسلوں سے نقش بنا رہے تھے۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ یہ تزین و آرائش کے شعبے سے منسلک ہیں اور اساتذہ کی طرف سے دی ہوئی اسائنمنٹوں پر کام کر رہے تھے۔

قدیم مصری عقائد اور عورت

عجائب گھر کی تیسری منزل پر بڑے بڑے ہالوں میں فراعین اور ان کی بیگمات کی قبروں سے برآمد ہونے والی اشیاء رکھی گئی تھیں۔ ان اشیاء کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ فراعین کی ملکائیں اپنی زیبائش کا کس قدر خیال رکھتی تھی۔ چہروں پر غازہ، ہونٹوں پر سرخی، ناخنوں پر رنگ، بالوں اور جسم کو نفیس رکھنے کے لیے تیل یہاں تک کہ مصری خواتین کے مجسموں کی آنکھوں پر بھی روغن سرمے لگے تھے۔ اس کے علاوہ مختلف کریمیں، آئینے، استرے، بالوں کی سوئیاں، کنگھیاں، سنگھار پیٹی، رکابیاں، چمچ، لکڑی، ہاتھی دانت سے بنی اشیا، سونے کانسی اور دیگر قیمتی دھاتوں سے بنے زیورات کے بے شمار نمونے یہاں نمائش کے لیے رکھے گئے تھے۔ عجائب گھر میں مصریوں کے قدیم برہنگی سے لے کر ایام سلطنت کے پر تکلف ملبوسات تک ہر عمر اور حیثیت کے مرد و خواتین کے لباس آویزاں تھے۔ وہاں موجود ایک گائیڈ نے ہمیں بتایا کہ اس زمانے میں بچے اور بچیاں اٹھارہ انیس سال تک بالیوں اور گلو بندوں کے علاوہ بے لباس پھرتے تھے۔ تاہم لڑکیاں کمر کے گرد منکوں کا کمر بند باندھ کر ایک ظاہری حجاب بناتیں، ملازم اور کسان لوگوں کے عام کپڑوں میں

صرف ایک لنگوٹی شامل تھی۔

قدیم بادشاہت میں آزاد مرد اور عورتیں ناف تک برہنہ پھرتے اور کمر سے گھٹنوں تک کا حصہ چھوٹی سی چست قمیض سے ڈھانپتے۔خوشحال گھرانوں کی عورتیں چست قمیض ترک کر کے ڈھیلی ڈھالی قبا پہنتی تھیں جو کندھے کے اوپر سے آگے آتی اور دائیں چھاتی کے نیچے گرہ کی صورت میں بندھی ہوتی۔

فرعونوں کے زمانے میں عورت اور مرد دونوں زیوارات کو پسند کرتے اور گردن، چھاتی، بازوؤں، کلائیوں اور ٹخنوں کا زیور پہنتے تھے۔جب دوسری اقوام سے مراسم بڑھے تو زیورات سے محبت صرف اشرافیہ تک محدود نہ رہی بلکہ عام لوگوں میں بھی اس نے رواج پایا۔صرف عورت ہی نہیں مرد بھی کان چھدوانے اور قیمتی پتھروں کے کنگنوں، انگوٹھیوں، بندوں اور منکوں سے سجتے سنورتے۔میں نے دکتور محمود کو کہا اگر اس زمانے کی مصری عورت کو آج زندہ کر دیا جائے تو وہ اس زمانے کی عورتوں سے بہت کچھ سیکھے گی۔مگر زیبائش اور زیورات کے استعمال میں جدید زمانے کی عورت کی استاد بنے گی۔

جیزہ

مسافر کی اگلی منزل جیزہ تھی جو زیریں قاہرہ سے کوئی اٹھارہ بیس کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے یہاں لے جانے کا انتظام دکتورہ بسنت کے ذمے تھا۔ان کے ہمراہ ان کے دو بچے اور خوش پوش وخوش شکل شوہر احمد بھی تھا۔احمد سے معانقے کے بعد ہم ان کی گاڑی میں بیٹھے اور جیزہ کی طرف روانہ ہوئے۔دریائے نیل ایسے ہم رکاب تھا جیسے کسی نے اہرام تک سیاحوں کو پہچانے کی ذمہ داری لگائی ہو۔آپ قاہرہ کے جس بھی حصے میں ہوں نیل اپنی موجودگی اور ہم رکابی کا احساس دلاتا ہے۔مصری جیزہ کو گیزہ بولتے ہیں۔یہاں دنیا کے سات عجوبوں میں

سے ایک عجوبہ آباد ہے جو اصل میں فراعین مدفن ہیں۔قاہرہ سے جیزہ تک سڑک کشادہ ہے مگر پشاور کے قصہ خوانی بازار اور لاہور کی پرانی انارکلی کی طرح سڑک ریڑھی بانوں، چائے اور شیشہ کے کھوکھوں، غیر قانونی بس اڈوں اور سڑک پر چونچ نکالی ویگنوں، بساط بچھائے سنیا سیوں اور میوہ وسبزی فروشوں نے تل دھرنے کو جگہ نہیں چھوڑی تھی۔یہ تو دکتورہ بسنت کے شوہر احمد کا کمال تھا کہ اس اژدھام میں بھی پرسکون اعصاب کے ساتھ گاڑی کو اہرام تک بہ حفاظت پہنچایا۔احمد صاحب نے سیاحوں کی بھیڑ میں جا کر ہمارے لیے ٹکٹ خریدے۔ہم پیدل ایک ڈھلوان پر روانہ ہوئے ہمارے سامنے تین مخروطی اہرام اپنے مکمل قد کاٹھ کے ساتھ ایستادہ تھے۔دکتورہ بسنت نے کہا یہ مصر کے عظیم اہرام ہیں۔یہ خوفو کا اہرام ہے دوسرا خافراع کا اور تیسرا میکادرکا ہے۔میں نے پوچھا اور ابولہول کہاں ہے انھوں نے ہاتھ کے اشارے سے کہا وہ بیٹھا ہے مگر ہم اس کی پشت پر ہیں اس کا چہرہ دیکھنے نیچے جانا ہوگا۔

ریت گرد اور دھول مٹی سے اٹے بلند و بالا مدفنوں میں واقعی ایک کشش تھی۔جیزہ کی صاف فضا اور کھلے آسمان میں مخروطی پیرامیڈ اپنے ہونے کا احساس دلا رہے تھے۔میں نے دکتورہ بسنت سے پوچھا کہ اردو کے صاحب اسلوب ادیب مختار مسعود کی کتاب ''آوازِ دوست'' پڑھی ہے؟اس میں اہرام مصر بنانے والوں کے حوالے سے بڑی خوبصورت بات لکھی ہے۔انھوں نے کہا کتاب تو نہیں پڑھی مگر نام سنا ہے۔میں نے کہا مختار مسعود اس کتاب میں لکھتے ہیں کہ جب اہرام مصر کا معمار موقع پر پہنچا تو اس نے صحرا کی وسعت دیکھ کر فیصلہ کیا کہ عمارت بلند ہونی چاہیے۔پھر اس نے بھری بھری اور نرم ریت کو محسوس کیا اور سوچا کہ اس عمارت کو سنگلاخ بھی ہونا چاہیے۔جب دھوپ میں ریت کے ذرے چمکنے لگے اسے خیال آیا کی اس کی عمارت شعاعوں کو منعکس کرنے کے بجائے اگر جذب کر لے تو اچھا تقابل

ہوگا۔ ہوا چلی تو اسے ٹیلوں کے نصف دائرے بنتے بگڑتے نظر آئے اور اس نے اپنی عمارت کو نوک اور زاویے عطا کر دیے۔ اتنے فیصلے کرنے کے بعد اسے طمانیت حاصل نہ ہوئی تو اس نے طے کیا کہ زندگی تو ایک قلیل اور مختصر وقفہ ہے وہ کیوں نہ موت کو ایک جلیل اور پائیدار مکان بنا دے۔ دکتورہ بسنت کو مختار مسعود کی پیچیدہ گفتگو تو سمجھ میں نہ آئی مگر وہ اس بات پر خوش تھی کہ وہ اپنے مہمان کو جہاں لائی ہے وہ جگہ اور اس کے فنِ تعمیر سے متاثر ہے۔

کہا جاتا ہے کہ مصر میں ایک سو اڑتیس اہرام ہیں۔ مگر ان عمارات میں بڑی عمارت بادشاہ خوفو کا مدفن ہے۔ ماہرین علم الآثار کے بہ قول یہ عمارت چار سو پچپن فٹ بلند ہے اور اس کا احاطہ تیرہ ایکڑ ہے۔ اس کی تعمیر میں پچیس لاکھ کے قریب چونا پتھر کے بلاکس استعمال ہوئے ہیں جبکہ تعمیر کا دورانیہ تقریباً دو عشروں پر محیط ہے۔ مسافر نے عشروں کو دنوں میں تبدیل کیا تو معلوم ہوا کہ اندازاً ایک درجن پتھر روزانہ نصب کیے گئے۔ سمندری آثارِ قدیمہ کی محقق مائی ایلریانی سے میں نے پوچھا کہ بیس سے اسی ٹن ایک ایک بلاک کو اس ریگ زار تک کیسے پہنچایا گیا تو انھوں نے جواب دیا کہ تقریباً آٹھ سو کلومیٹر دور سے نہر کھود کر اور بہت سارے جانور مار کر ان کے چمڑوں میں ہوا بھر کر ان سے کشتیاں بنا کر ان پر یہ پتھر لاد کر جیزہ پہنچائے گئے۔ حیرانی سے میری بھنویں ماتھے پر چڑھ گئیں۔ میں نے کہا یہ کام فرعون ہی کر سکتے تھے عام انسانوں کا اتنا دل گردہ نہیں۔ وہ بولی ہنر مندوں نے ان پتھروں کو اس سلیقے سے پیوست کیا ہے کہ آپ ان کے درمیان اے ٹی ایم کارڈ بھی نہیں گھسیڑ سکتے۔ ان پتھروں پر جو لپائی کی گئی ہے وہ صدیوں تک قائم رہی اور جب تک وقت کی ریخت و شکست اور زلزلوں کی وجہ سے لپائی اکھڑ گئی تو ایک مسلمان بادشاہ ناصر الدین الحسین نے اس سے ایک قلعہ اور مسجد تعمیر کی تھی۔

مسافر نے دکتورہ بسنت سے پوچھا کہ فراعین اہرام کیوں تعمیر کرتے تھے تو انھوں نے

سوچے بغیر جواب دیا بادشاہ تھے، بڑے لوگ تھے، بنانے کی سکت رکھتے تھے اس لیے بنا دیے ہوں گے۔ میں نے گوگل استاد اور ہیروڈٹس سے جواب مانگا تو انھوں نے بھی ''کیوں'' بنائے تھے سے کنی کترائی ہاں البتہ کیسے بنائے تھے کا تفصیلی جواب دیا۔ مسافر ایک بار مظفر آباد کے جلال بابا پارک کی بغل میں واقع کے ایچ خورشید لائبریری میں کشمیر میں حمد نعت کی روایت کے حوالے سے اپنے دوست شاگرد محمد یوسف میر کے ساتھ کتب کی پھرولا پھرولی کر رہا تھا کہ ایک خستہ حال اور دیمک زدہ کتاب ہاتھ لگ گئی۔ سرورق ندارد، مصنف اور چھاپہ خانے کے نام والے صفحات بھی اڑ گئے تھے۔ کتاب کے موضوعات بہلونی، سومیری اور فراعینی تواریخ پر مبنی تھے۔

''کیوں'' بنانے کا جواب اس کتاب میں موجود تھا۔ کتاب کا مصنف لکھتا ہے کہ ان کا مقصد تعمیراتی سے زیادہ مذہبی تھا۔ اہرام مقبرے تھے نسل در نسل قدیم ترین مقبرے۔ عوام کی طرح فراعین کا اعتقاد بھی یہی تھا کہ ہر زندہ جسم میں ایک ہمزاد ''کا'' آباد ہے جو سانس کے نکل جانے سے مرتا نہیں اور یہ کہ اگر گوشت کو بھوک، تشدد اور زوال سے محفوظ کر لیا جائے تو یہ ہمزاد بھی مکمل طور پر زندہ رہتا ہے۔

مصنف ایک اور گتھی سلجھانے کی کوشش کرتے ہیں کہ ہرم یعنی پیرامیڈ مصری لفظ پی۔ ری۔ مس یعنی بلندی سے ماخوذ ہے نہ کہ یونانی لفظ پیرامیڈ یعنی ''آگ'' سے۔ ہرم اپنی بلندی بناوٹ اور لافانیت کے ذرائع کے طور پر استحکام کا متقاضی تھا اور اگر مختلف ٹھوس اشکال کا کوئی گروپ بلا مزاحمت زمین پر گرائے جانے سے جو قدرتی شکل اختیار کرتا (اپنے چار کونوں کے علاوہ) اہرام بھی ویسے ہی ہیں۔ پھر ہر دوام اور شکوہ کے لیے بھی تھا چناں چہ پتھروں کو دیوانہ وار صبر و سکون کے ساتھ یوں اوپر نیچے ڈھیر کیا گیا جیسے وہ سیکڑوں میل دور پتھر کے کانوں سے کان پکڑ نہیں لائے گئے بلکہ سرِ راہ اگ آئے ہیں۔

میں نے دکتورہ بسنت سے پوچھا کہ مصری فراعین اپنی لاشوں کے ساتھ کھانے پینے کی اشیاء، جنگی آلات، سونے جواہرات غرض کیا کیا دفناتے تھے تو اس حوالے سے ان کا عقیدہ کیا تھا؟ جواب ملا جو ہندوستان میں ہندوؤں کا عقیدہ تھا۔ جب وہ وفات پاتے تو نہ صرف اسباب و اشیاء بلکہ عورتوں، بیویوں اور غلاموں کو بھی ''ستی'' کرتے تا کہ ابدی زندگی میں بھی ان کے عقیدے کے مطابق ان کی خدمت گزاری اور عیش و عشرت کا سامان مہیا ہو سکے۔ دکتور محمود سے مسافر نے پوچھا کہ ''کا'' کا درازیٔ حیات کا تصور اگر فراعین کے ذہنوں میں نقش تھا تو پتھروں، لوہے، سونے کی بڑی بڑی سلوں سے تابوت بنا کر اس میں جسموں کو بقائے ابدی بہم پہنچانا چہ معنی دارد؟ دکتور محمود نے جواب دیا کہ ''کا'' کا مضبوط اور غیر متزلزل عقیدہ فراعین میں موجود تھا۔ مگر اطمینانِ قلب بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ انسان کو اپنے جسم سے محبت ہے اور اسی جسم کے ساتھ دوبارہ زندہ ہونے یا ابدی طور پر زندہ رہنے کی خواہش انسان سے بہت کچھ کرواتی ہے۔ شاید اسی مقصد کے لیے انتہائی محنت سے حنوط کاری کر کے ان اجسام کو تابوتوں میں مدفون کیا گیا اور آج بھی ہزاروں سال گزرنے کے باوجود ان فراعین کے جسموں میں صرف گوشت اور چمڑے چمٹے ہوئے ہیں بلکہ بالوں میں بھی بال برابر فرق نہیں آیا۔

ہیرڈوٹس کے مطابق حنوط کاری کرتے وقت پہلے ایک لوہے کے آنکڑے کے ساتھ مغز انسانی کو نتھنوں کے راستے باہر نکالا جاتا، اس کے بعد کھجوری شراب سے پیٹ کو دھو کر عطر چھڑکا جاتا۔ املتاس، لوبان اور دیگر ادویات نما عطریات سے پیٹ بھرا جاتا اور دوبارہ سی دیا جاتا۔ اس کے بعد جسم کو خام شورے میں دو ماہ دس دن تک ڈبوئے رکھنے کے بعد مومی کپڑے میں لپیٹ کر اس کپڑے کے اوپر گوند لگایا جاتا، پھر جسم کو قیمتی تابوتوں میں بند کر کے اہراموں

کے اندر بنے کمروں میں رکھ کر ساتھ قیمتی اشیا چھوڑ آتے ۔ یوں ان کا دبدبہ دنیا اور مذہبی ہر حوالے سے مسلم ہو جاتا۔

ہم خوفو کے مقبرے سے اترائی میں چل پڑے اور تقریباً بیس پچیس منٹ پیدل راستہ طے کرنے کے بعد ابوالہول کے سامنے کھڑے ہو گئے ۔ میرا خیال تھا کہ میں ابوالہول کے عظیم الجثہ قامت کو چھو سکوں گا مگر ایسا ممکن نہ تھا۔ کئی ایکڑ پر محیط ابوالہول کو چاروں طرف سے خار دار تار لگا کر اس کے پنجوں کے نیچے سے خوفو اور خافراع کے مقبروں تک جانے والی سرنگوں میں ارضیات اور علم الآثار کے ماہرین کام کر رہے تھے ۔ مجھے ان سرنگوں میں جانے کا کوئی خاص تجسس نہ تھا۔ مجھے ابوالہول کے خارجی حسن سے لطف لینا تھا اور یہ لطف جتنا دور سے دیکھنے میں ملتا درون خانوں سے نہ ملتا۔ ابوالہول بھی آئل پینٹنگ، ادھیڑ عمر کی عورت اور پہاڑ کی طرح ہے جتنا فاصلے سے دیکھو گے زیادہ کشش محسوس کرو گے ۔ احمد نے مجھ سے مختلف پوز بنوا کر اپنے موبائل کیمرے میں عکس بندی کی میں نے دکتور محمود سے پوچھا کہ ابوالہول تو عربی زبان کا لفظ ہے ۔ فراعین اور مصری اس زمانے میں اس کو کس نام سے پکارتے تھے ۔ بولے فرعونک نام مجھے نہیں معلوم مگر ابوالہول یعنی خوف کا باپ اس کو فاطمی دورِ حکومت میں عربوں سے ملا۔ اس سے پہلے اس کا نام ''بلھیت'' تھا۔ شیر کے دھڑ اور انسانی سر والے ابوالہول کو جب میں نے بلھیت کہہ کر پکارا تو اس کی وجاہت اس کا رعب اور دبدبہ ماند پڑ گیا۔ یوں لگا جیسے یہ طلسمی وجود مجھ سے ناراض ہو گیا ہو۔ میں نے محمود کو کہا ابوالہول لفظ میں جو شان و شوکت ہے وہ بلھیت میں نہیں۔

مصر کے ابوالہول سے مستعار یونانیوں نے بھی ایک ابوالہول اساطیر تراشا ہے ۔ ان کے دیو مالاؤں میں ایک مادہ ببر شیر نی ہے جس کا چہرہ نسوانی اور کندھوں کے ساتھ پنکھ لگے

ہیں۔اس کے حوالے سے یونانی کہاوت ہے کہ یہ ابوالہول مؤنث ہے جو یوٹیا کی ایک اونچی پہاڑی پر رہا کرتی تھی اور جو شخص اس کے سامنے سے گزرتا وہ اسے ایک معمہ حل کرنے کو دیتی جو درست حل نہ بتاتا اس کو ہڑپ کر جاتی بالآخر ایک ہیرو اوڈیپس نے اس کے معمے کا درست حل بتا دیا اور یوں اس کی موت واقع ہوگئی۔دکتورہ بسنت بولی یہ معمہ کیا تھا۔میں نے کہا یونانی قصہ گو ہومر کا کہنا ہے کہ معمہ یہ تھا کہ وہ کون ہے جو صبح چار ٹانگوں پر چلتا ہے دوپہر دو ٹانگوں اور پھر شام کو تین ٹانگوں پر۔

ابوالہول کی لمبائی ۱۸۹ فٹ اور اونچائی ۶۵ فٹ ہے۔دور سے پہاڑ کی طرح نظر آنے والا یہ مجسمہ ہزاروں سال قبل ایک چٹان کو تراش کر بنایا گیا تھا۔اس کی انسانی شکل کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ فرعون خافرع کی شبیہ ہے جبکہ بعض ماہرین کا خیال ہے کہ یہ خافرع کے بھائی ریدی دِف سے ملتی ہے۔Lime stone کو تراش کر بنائے گئے ابوالہول کے مجسمے میں کئی رنگ اور شیڈز کی آمیزش اور ملمع کاری کی گئی ہے۔ہزاروں سال گزرنے کے باوجود یہ رنگ اب بھی تازہ ہیں۔اس کے سر پر ایک روایتی فرعونی رومال ہے اور اس کی پیشانی پر ناگ کی شبیہ صاف دکھائی دیتی ہے۔ناگ کی شبیہ کو قدیم مصری ودجت اور رومال کو دیوتا ہورس کے پھیلے ہوئے پروں کا عکس سمجھتے ہیں۔

کسی زمانے میں دریائے نیل ابوالہول کے قدموں سے ہو کر گزرتا تھا۔صحرانشینوں سے زیادہ پانی کی قدر کس کو ہوسکتی ہے۔شاید ابوالہول کو ایک ایسے دریا کی نگرانی سونپی گئی ہوگی جو خشک سالی سے بھی دوچار ہوتا تھا جیسا کہ ان کا عقیدہ تھا کہ ابوالہول ہی ان کی حفاظت پر مامور ہے اور اس کے ہوتے ہوئے ان کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔بہرحال ان اساطیری روایات سے زیادہ میں اس کے جمالیاتی پہلو پر یقین رکھتا ہوں کہ بادشاہ اکثر جھیلوں اور

دریاؤں کے قریب محلات بنا کر فطری حسن سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ مصر کے بادشاہوں نے بھی نیل کے کنارے اپنے مسکن اور مدفن بنا کر جمالیاتی حظ کے حصول کی کوشش کی ہوگی اور کیوں نہ ہو کہ وہ موت کے بعد ابدی زندگی کے خواہش مند اور متلاشی تھے۔ ابوالہول کے بالکل سامنے ایک چھوٹی سی مسجد ہے۔ احمد صاحب نے کہا کہ یہاں رش بہت زیادہ ہوتا ہے آج جمعہ بھی ہے اس لیے ہمیں جلدی مسجد جانا چاہیے۔ جمعہ کا خطبہ شروع تھا خطیب صاحب جنگ تبوک میں مسلمانوں کی کسمپرسی اور خلفائے راشدین کی سخاوت پر بحث کر رہے تھے۔ لن تنا البر حتی تنفقو مما تحبون کے ذیل میں صحابہ رسولؐ کے جذبہ ایثار کا تذکرہ کر رہے تھے۔ جہاں جہاں رسولِ خداؐ کا ذکر آتا حاضرین جہراً درود پاک پڑھنے لگتے۔ میں جس جگہ بیٹھا تھا وہاں سے کھڑکی میں ابوالہول اور خوفو کا مقبرہ واضح نظر آ رہا تھا۔ مسافر کو اس چھوٹی سی مسجد سے خوفو کا دبدبہ اور ابوالہول کی دہشت ماند پڑتی دکھائی دے رہی تھی۔ ان دونوں کی شکل ایک کھلونے سے بڑھ کر نہ تھی۔ انہ طغیٰ کے خلاف جنگ جو جنگ حضرت موسیٰؑ نے شروع کی تھی پیغمبر اسلام حضرت محمد ﷺ کے نام لیواؤں اور صحابہ رسول نے اس کی تکمیل کر دی تھی۔ وکلمتہ اللہ ھی العلیا کی آوازیں دہشت کی علامت اور خوف کے باپ کے کانوں سے ٹکرا رہی تھیں۔ مصری باشندے حضرت ابراہیمؑ اور آلِ ابراہیمؑ پر درود وسلام بھیج رہے تھے مسافر نے ٹکٹ پر لگے ابوالہول کے کان میں کہا و تعزو من تشاء وتذل من تشاء بیدك الخیر۔ اب تمھاری حیثیت اہلِ مصر کے لیے تماشے کے کھلونے اور اساطیر لاولین کے سوا کچھ نہیں۔ دکتور محمود نے پوچھا کہ اہرام دیکھ کر کیا تاثر لے کر جا رہے ہو۔ میں نے کہا یہاں میں نے اہرام بھی دیکھا اور حرم خدا بھی، فراعین کے ان مقابر اور ابوالہول کے مجسمے کی شان وشوکت، جمال وجلال، قوت وہیبت، رعب ودبدبہ واضح نظر آتا ہے جبکہ اس چھوٹی سی مسجد میں صرف

آدھی خوبیاں جھلک رہی ہیں۔شان ہے مگر شکوہ ندارد، جمال ہے مگر جلال ناپید، ایمانی قوت ہے مگر ہیبت محال، رعب کا اثر ہوتا ہے مگر دبدبہ نظر نہ آیا۔

قلعہ ایوبی

قاہرہ میں ایک جگہ اسلامی تاریخ کی تین بڑی مساجد اور قلعہ ہے چونکہ یہ جگہ شہر سے اونچائی پر واقع ہے اس لیے اگر باقی شہر کو تماشا گاہ یا اسٹیج تصور کیا جائے تو یہ جگہ بالکونی کہلائے گی۔ یہاں قلعہ سلطان صلاح الدین ایوبی، مسجد علی مملوکی، مسجد رفاعی اور مسجد سلطان حسن کی خوب صورت عمارات دیکھنے والوں کی آنکھوں اور ذہن وفکر کو خیرہ کرتی ہیں۔قلعہ ایوبی عظیم سپہ سالار سلطان صلاح الدین ایوبی نے گیارہ سو چھہتر سے گیارہ سو تراسی عیسوی میں شہر کو عیسائی حملہ آوروں سے بچانے کے لیے قاہرہ شہر کے قلب میں بنایا تھا۔مسافر نے دکتور محمود سے اس قلعہ کی اہمیت کے بارے میں پوچھا تو کہنے لگے قاہرہ شہر اور یہاں کے باسیوں پر سلطان صلاح الدین ایوبی کے بہت سے احسانات ہیں۔اس شہر اور اہلِ شہر کو صلیبی جنگوں میں یورش پسندوں اور ان کی یلغاروں سے بچانے میں اس قلعہ کا بہت بڑا کردار ہے۔مصری حکمرانوں نے تقریباً سات صدیوں تک اس قلعہ سے اہلِ قاہرہ کی حفاظت کی ہے۔

قلعہ ایوبی کی دیواریں دس میٹر لمبی اور تین میٹر چوڑی ہیں۔خود سلطان صلاح الدین ایوبی نے اس قلعہ کے اندر ایک گھر ایک مسجد اور ایک لائبریری بنوائی تھی۔مسافر کو صلاح الدین ایوبی کی یہ تعمیرات اچھی لگیں فرزندانِ تثلیث کے خلاف جنگ کرنے والے جرنیل کو جسمانی لحاظ سے پرسکون رہنے کے لیے ایک محفوظ گھر قلبی سکون کے لیے ایک مسجد اور ذہنی سکون کے لیے ایک لائبریری سے بہتر انتخاب کیا ہوسکتا ہے۔بلاشبہ دنیا کی امامت جس کو درپیش ہو وہ ان تین جگہوں کے بغیر نامکمل اور منتشر شخصیت کا مالک ہوگا۔قلعہ تو اپنی جگہ موجود

ہے مگر مسجد، لائبریری اور گھر ناپید ہیں۔شاید مسلمانوں کو اب نہ دنیا کی امامت درپیش ہے اور نہ ہفت کشور تسخیر کرنے کے لیے تیغ وتفنگ درکار ہے۔

مسجد سلطان حسن اور رفاعی مسجد

قلعے کے دائیں طرف سلطان حسن اور بائیں جانب رفاعی مسجد کی بلند و بالا عمارات دامنِ دل کھینچتی ہیں۔ان دونوں مساجد کے درمیان ایک کشادہ شاہرہ ہے جو ان مساجد کے آخر میں ایک وسیع وعریض باغیچے میں اختتام پذیر ہوتی ہے۔راستے کے دونوں جانب دو فٹ چوڑی اور اتنی ہی اونچی دیوار ہے جس نے راستے کی حنابندی کی ہوئی ہے۔دکتورہ بسنت نے اپنے پرس سے ایک چادر نکالی اور اس دیوار پر بچھا دی۔اس کے بعد انھوں نے ڈبل روٹی، کھیرے، پنیر اور جیم کی ایک ڈلی چادر کے اوپر چن دی۔پرس کے اندرونی جیب سے چھری نکالی ڈبل روٹی کو درمیان سے کاٹا اس کے اندر کھیرے اور پنیر کو جیم لگا کر رکھ دیا اور ہمارے سامنے پیش کر دیا۔دکتورہ بسنت کی اس پرخلوص دعوتِ شیراز پر کون نہ مرتا۔

مصری عورت فرعون کے زمانے سے تاحال بااختیار ہے۔امورِ خانہ داری سے امورِ حکمرانی تک یہ باہمت عورت پدرسری معاشرے میں بھی اپنے حقوق اور فرائض سے لطف اندوز ہوتی رہی ہے۔دعوتِ شیراز کے بعد ہم الرفاعی مسجد کی طرف روانہ ہوئے تو ایک خاتون اور دو مرد ہماری طرف آئے اور مجھ سے پوچھا کہ آپ ہندوستان سے آئے ہیں۔میں چونکہ شلوار قمیض میں تھا اس لیے ان کو میرے مصری نہ ہونے پر یقین ہو گیا۔میں نے کہا میں پاکستان سے ہوں۔انھوں نے مجھے چالیس جنین کی ٹکٹ پکڑا دی تو میرے میزبانوں کو مصری محکمہ سیاحت والوں کی یہ حرکت بری لگی۔احمد نے ان سے یہ کہا کہ یہ مسلمان ہیں ایک مسلمان کے مسجد میں داخل ہونے پر آپ ان سے ٹکٹ لیں گے؟انھوں نے کہا یہاں لوگ نماز تو پڑھتے

نہیں تاریخ دیکھنے آتے ہیں اس لیے ٹکٹ لینا ضروری ہے۔

مسجد رفاعی دیکھ کر دل باغ باغ ہو گیا۔ یہ قرونِ وسطیٰ کی عمارات کی بڑی نشانی ہے۔ مسجد کل بارہ ستونوں پر ایستادہ ہے۔ آٹھ ستون دیواروں کے ساتھ پیوست ہیں، مرکزی گنبد کو چار ستونوں نے اٹھایا ہوا ہے، ہر ستون کی چوڑائی تقریباً دس فٹ اور بلندی پچاس میٹر سے زیادہ ہے۔ ان ستونوں پر نقش و نگار اسلامی فنِ تعمیرات کا بہترین نمونہ ہیں۔ دلفریب غالیچوں اور دیواروں پر منفرد نقش و نگار نے اس مسجد کی خوبصورتی میں اضافہ کر دیا تھا۔ مسجد کے اندر رفاعی فرقے سے وابستہ احمد رفاعی کا مزار بھی ہے۔ اہلِ صوف کے نزدیک احمد رفاعی کی فکر اور سوچ کی اہمیت کے پیشِ نظر ان کے پیروکاروں کی تعداد اچھی خاصی ہے۔ اس مسجد میں احمد رفاعی کے علاوہ بھی کئی حکمرانوں کے مزارات ہیں جن میں اسماعیل پاشا اور شاہ فاروق جو آخری مصری بادشاہ تھے اور اہلِ مصر میں ان کی نیک شہرت و سیرت کو مقبولیت حاصل ہے۔ اس کے علاوہ ایرانی بادشاہ رضا شاہ پہلوی بھی کچھ عرصے کے لیے یہاں آسودہ خاک رہے، بادشاہ سلامت انیس سو چالیس میں جنوبی افریقہ میں وفات پا گئے تھے۔ جنگ عظیم دوم کے اختتام پر رضا شاہ پہلوی کا جسدِ خاکی ایران بھجوا دیا گیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ رضا شاہ کے تعلقات شاہ فاروق کے ساتھ قدرے اچھے تھے کہ اپنے جانشین صاحبزادے محمد رضا شاہ کی شادی شاہ فاروق کی بیٹی سے کر دی، مگر نبھ نہ سکی، شہزادی کو تہران میں دریائے نیل اور ایران میں بحیرہ روم کی کمی محسوس ہوئی اور تو اور موصوفہ کو یہ بھی گلہ تھا کہ سسرالیوں کو بادشاہت کا سلیقہ نہیں اس کام میں ابھی یہ کم سن ہیں۔ دوسرے فریق نے بھی لحاظ نہیں رکھا دعویٰ کیا جب رضا شاہ کی میت مصر سے ایران منتقل ہوئی تو تابوت کے ساتھ وہ تلائی تلوار موجود نہ تھی جو بہ وقتِ تدفین ان کے ساتھ رکھی گئی تھی، شاہ فاروق کو پسند آ گئی اور رکھ لی۔ اس مسجد میں رضا شاہ پہلوی کے

بیٹے محمد رضا شاہ کی قبر اسی پرانے سسرال میں دیکھ کر عبرت آمیز تاسف ہوا۔ پاکستان کے صوبہ خیبر پختونخواہ سے درآمد شدہ ماربل کے تعویذ میں مدفون محمد رضا شاہ کے جاہ وحشم کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ موصوف جب پہلی مرتبہ پاکستان آئے تو پاکستان کا ہر باشندہ بادشاہ کے دورے کی وجہ سے مسرور تھا۔ لوگوں نے کبھی اتنی دلچسپی کسی اور سربراہ کی آمد پر نہیں دکھائی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ قیام پاکستان کا اولین دور ہجرت، شہادت، حد بندی کی بے انصافیوں، جہاد کشمیر، قائداعظم کی علالت، کپڑے اور کوئلے کی قلت، سریے اور سیمنٹ کی گرانی اور بہت سی اداسیوں اور افسردگیوں پر مشتمل تھا۔ لوگ اس بوجھ کو اٹھائے ہوئے تھک گئے تھے اور دو گھڑی دل بہلانے کسی موقع کی تلاش میں تھے۔ وہ کام جو دوسری جنگ عظیم کے بعد فیسٹیول آف برطانیہ اور برسلز کی نمائش نے طویل لڑائی سے تھک کر چور ہونے والے یورپی باشندوں کے لیے سرانجام دیا تھا وہی کام اہلِ پاکستان کے لیے ہز امپریل مجسٹی شہنشاہ ایران کے دورے نے کیا۔ بہ قول مختار مسعود یہ پاکستان میں کسی بھی سربراہِ مملکت کا پہلا دورہ تھا۔ پہلے پہل تجربے کا نیا پن اور اشتیاق کا عالم اور یہ خوف بھی فطری تھا کہ کہیں استقبال میں ناتجربہ کاری کی وجہ سے کوئی کسر نہ رہ جائے۔ تعلیم یافتہ طبقہ بات بات پر عجم سے دیرینہ تعلقات کا حوالہ دے رہا تھا۔ فارسی جاننے والے زمین پر پاؤں نہ رکھتے تھے۔ عام آدمی یہ سوچ کر خوشی سے دیوانہ ہو رہا تھا کہ اپنی آنکھوں سے ایک مسلمان بادشاہ کو دیکھ سکے گا۔

رائل پاکستان ائیر فورس لڑاکا ہوائی جہازوں کے ایک سکوارڈ نے زاہدان سے شہنشاہ ایران کے فلائنگ فوٹرس ہوائی جہاز کو اپنی حفاظت میں لیا اور کراچی کی جانب پرواز شروع کی۔ چار جہاز فضا میں شہنشاہ کے جہاز کے اوپر تھے اور باقی چار اس کے نیچے، شہنشاہ کا جہاز کراچی اترا۔ وہ دروازے سے نکل کر سیڑھی پر کھڑے ہوئے تو فیوری سکوارڈ نے جھک کر سلامی

دی اور فضا میں گم ہو گیا۔ استقبال کے لیے خواجہ ناظم الدین اور لیاقت علی خان کے علاوہ ایک لاکھ شہری بھی تھے جو ہوائی اڈے سے گورنر جنرل ہاؤس کے درمیان جگہ جگہ کھڑے تھے۔ ہوائی اڈے پر گارڈ آف آنر کے دستے کی کمان لفٹیننٹ کرنل یحیٰ خان نے کی۔ مسلح افواج کے تینوں بدیسی سربراہ بھی سج دھج کر وہاں کھڑے تھے۔ رئر ایڈمرل جے ڈبلیو جے فورڈ، جنرل سر ڈگلس گریسی، ائر وائس مارشل آر ایچ رلے۔

مسافر ماضی کے اوراق میں گم محمد رضا شاہ پہلوی کی قبر پر ٹکٹکی باندھے دنیا و مافیھا سے بے خبر تھا کہ دکتور محمود نے کہا ایرانی انقلاب کے بعد شاہ ایران کو کسی مغربی ملک حتی کہ امریکہ نے بھی قبول نہیں کیا حالانکہ یہ انہی کا پروردہ تھا۔ میں نے کہا یا دکتور جب یہ مطلق العنان حکمران بادشاہی سے معزول کیا گیا تو اگلے دن اخبارات میں صرف دو لفظی سرخی لگی ''شاہ رفت'' نصف صدی کی پہلوی سلطنت کا قصہ دو لفظوں میں تمام ہوا اور پیرس میں جو آیت اللہ خمینی کو خبر ملی تو ان کا ردِ عمل بھی دو لفظی ہی تھا۔۔۔ اللہ اکبر۔

مسجد الرفاعی کے سامنے مسجد سلطان حسن ہے۔ اس مسجد کی خوبصورتی اور دیدہ زیبی تو مسلمہ ہے مگر مسافر کو جس چیز نے متاثر کیا وہ یہاں کے چار کمرے تھے جو چاروں فقہا حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی کے مدرسین اور طلباء کے لیے بنا گئے تھے۔ یہاں ''یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان'' کا عملی نمونہ نظر آ رہا تھا۔ دکتورہ بسنت نے کہا اس مسجد کے بنانے والے سلطان حسن نے اس کی تعمیر ۱۳۶۱ء میں شروع کی اور چار سال بعد یہ مسجد جب تکمیل کو پہنچی تو سلطان حسن غائب ہو گئے اس کے بعد ان کا کوئی پتہ نہیں چلا کدھر چلے گئے۔ میں نے کہا جہاں چاروں فقہا کے پیروکاروں کے لیے جگہیں مختص ہوں ایسی خوبصورت مسجد بنانے والے غائب نہیں ہوتے، دلوں میں رہتے ہیں۔ سلطان حسن مسجد چونتیس میٹر لمبی اور اتنی ہی چوڑی ہے۔

اس مسجد کے مرکزی حصے میں ایک بڑا وضو خانہ ہے جس پر لکڑی کا دلکش گنبد سایہ فگن ہے۔ وضو خانے میں اب پانی ناپید ہے لوگ اب اس جگہ تصویریں بناتے ہیں ہم نے بھی یہاں احمد کے کیمرے میں عکس بندی کی۔ مسجد کی دیواریں اور محرابوں میں کانسی کی کھڑکیاں بنائی گئی تھیں۔ جن کے اردگرد دیدہ زیب ماربل کو بیل بوٹیوں سے مزین کیا گیا تھا۔

مسجد علی

قلعہ سلطان صلاح الدین ایوبی کے پہلو میں ایک اور خوبصورت مسجد ہے۔ مصری بادشاہ محمد علی پاشا کے نام سے موسوم یہ مسجد انیسویں صدی کے نصف اول میں تعمیر ہوئی۔ سنگِ مرمر سے تعمیر ہونے والی اس مسجد میں تقریباً نصف صدی تک حکمران رہنے والے علی پاشا اور ان کی بیوی آسودۂ خاک ہیں۔ محمد علی پاشا جب ترکی کے دورے پر گئے تو آیا صوفیہ کی تعمیر کا عکس دل و نگاہ میں رچ بس گیا۔ مصر آتے ہی ایسی ہی گنبدوں کی مسجد کی تعمیر کا حکم دیا۔ مسجد کا مرکزی گنبد گل سرسبد کی طرح لگ رہا تھا۔ جس کو چار چھوٹے اور چار نیم دائرہ گنبدوں نے آغوش میں بٹھا رکھا ہے۔ اس سرسبد کا قطر تقریباً اکیس میٹر ہے جبکہ زمین سے اونچائی کوئی پچاس میٹر سے زیادہ لگتی ہے۔ سنگ مرمر سے بنی دیواریں اور ستون کم و بیش دس گیارہ میٹر ہوں گے۔ ترکی کی عثمانی حکومت کی بنائی ہوئی مساجد سے مشابہت رکھنے والی اس مسجد کے اندر دو منبر ہیں۔ بڑے منبر پر سلطان محمد علی پاشا خود خطبہ دیتے جبکہ چھوٹے منبر کا استعمال شاہ فاروق کیا کرتے تھے۔ مسجد کی دلکشی کا موجب بننے والا قالین پرانا ہوتے ہوئے بھی انمول لگ رہا تھا۔ کوئی پونے دو صدیاں پہلے ایرانی بادشاہ رضا شاہ پہلوی کی طرف سے تحفے میں ملنے والے اس قالین کی بنت ہاتھوں سے ہوئی تھی۔ بلاشبہ قالین بافی میں ایرانی ہنرمندوں کا سکہ ہر دور میں رائج رہا ہے۔ اقبالؒ جب انہی خوبصورت قالینوں پر خوابیدہ مسلمان نوجوان کو کاہلی اور سستی میں

مبتلا دیکھتا ہے تو گلہ کرتا ہے کہ

تیرے صوفے ہیں افرنگی ترے قالین ایرانی
لہو مجھ کو رلاتی ہے جوانوں کی تن آسانی

دکتور بسنت نے کہا کہ سلطان محمد علی شاہ مملوک تھے۔ میں نے مزید وضاحت پوچھی تو دکتور محمود کہنے لگے جس طرح ہندوستان میں خاندانِ غلاماں کا دور چلا تھا بالکل ایسے ہی مملوک بھی بادشاہوں کے ملکیتی غلام تھے جو ان کی فوج میں ملازم تھے وقت کے ساتھ ساتھ ایک طاقتور طبقہ بنا اور مصر و شام پر تقریباً چار صدیوں تک حکمرانی کی۔ لوس فلپ کی طرف سے دی ہوئی پیتل کی گھڑی مع مینار اس مسجد کے شمال مغربی حصے میں اب بھی موجود ہے۔ میں نے دکتور محمود کو کہا کہ دیکھو مصری سیاست پر فرانسیسی اثرات کی غمازی، ۱۸۴۵ء میں دی ہوئی یہ گھڑی اب بھی کام کر رہی ہے۔

مصر، مذہب اور مساجد

مغرب کا وقت قریب تھا ہم احمد کی گاڑی میں بیٹھ گئے ہماری اگلی منزل جامعہ الازہرہ تھی۔ فرعون، پیراڈ، ابوالہول، مسجد علی، مسجد رفاعی اور مسجد حسن کے بعد اب جامعہ الازہر اور مسجد حسین۔ ایک دن میں جتنے مقامات دیکھے ان کا تعلق مذہب سے بنتا ہے۔ مصریوں کو عبادت اور عبادت گاہوں سے عشق ہے چاہے فرعون کا زمانہ، عیسائیوں کا یا مسلمانوں کا۔ سکون قلب اور فرض عبودیت کے حصول و بجا آوری کے لیے عبادت گاہیں تعمیر کرنا ان کا پسندیدہ مشغلہ ہے۔ جیزہ کے اہراموں سے لے کر سینٹ کیتھرائن، قاہرہ کے گرجا گھروں اور مسجدوں کی ایک لمبی فہرست ہے۔ مصری نہ صرف اچھے عبادت گزار ہیں بلکہ عمارت گر بھی ہیں۔ میں نے کسی عبادت خانے کی عمارت بے ڈول، بے مزہ اور غیر متوازن نہیں دیکھی۔ تعمیر اور عبادت ہر دو حوالوں سے مصری مساجد آباد نظر آتے ہیں۔ جہاں اذان کی آواز کان

میں پڑی وہیں کاروبارِ زیست رک جاتا ہے اور عبودیت کا اہتمام شروع ہو جاتا ہے۔ قرآن سے مصریوں کی محبت کوئی پوشیدہ راز نہیں ہر گھر میں حفاظ موجود ہیں اور ہر مسلمان مصری کو قرآن کا ایک بڑا حصہ ازبر ہے۔ قرآن کو خوش الحانی سے پڑھنے میں شاید ہی کوئی دوسرا مسلمان مصریوں کا مقابلہ کر سکے۔ ویسے تو خوش الحانی کے اس فن کو بہت سے قرأ نے برتا ہے مگر مجھے قاری عبدالباسط کی تلاوت نے زیادہ اپنی طرف راغب کیا ہے۔ مصر میں انیس سو ستائیس میں پیدا ہونے والے اس خوش الحان قاری کی تجوید مصری مسلمانوں کے لیے بالخصوص اور باقی مسلم دنیا کے لیے بالعموم ایک تحریک بنی اور اب بھی بہت سے مصری اور غیر مصری قرأ اُن کے تتبع میں انہی کی طرح تلاوت کرتے اور داد وصول کرتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ملکہ برطانیہ ایلزبتھ دوم قاری صاحب کی بڑی مداح تھیں اور جب ترکی یا مصر جانا ہوتا تو قاری باسط سے سورۃ الرحمٰن کی تلاوت ضرور سنتیں۔

مسافر قاہرہ کی ایک بڑی شاہرہ کے ایک نکڑ پر کھڑا تھا سامنے مسجد حسین اور خان الخلیلی بازار دین و دنیا کی علامت کے طور پر نظر آ رہے تھے۔ ساتھ ہی ایک کشادہ سڑک تھی جس کے دوسرے سرے پر جامعہ الازہر کے میناروں پر لگے لاؤڈ سپیکر سے خطیب دین و دنیا کے مابین ربط و توازن پر خطبہ دے رہا تھا۔ دکتور محمود نے پوچھا پہلے کہاں جائیں میں نے جواب دیا دین و دنیا کی طرف جانے سے پہلے ربط و توازن کا توشہ لیتے ہیں۔ محمود کو میری بات سمجھنے میں کوئی دشواری نہ ہوئی انھوں نے مسجد الازہر شریف کی راہ لی۔ بارش کی وجہ سے مسجد کی سیڑھیوں پر پھسلن زیادہ تھی ہم نے جوتے اتار کر پا برہنہ مسجد میں قدم رکھا تو محسوس ہوا کہ دین میں توازن قائم رکھنا آسان کام نہیں۔ ہم کم و بیش ہزار سال پرانی عمارت میں کھڑے تھے، یہ عمارت مسلم دنیا میں دینی و مذہبی علوم کے ساتھ ساتھ دنیاوی معاملات پر بھی تحقیقی و تنقیدی نگاہ رکھنے میں ایک مستند حوالے کے طور پر جانی جاتی ہے۔ میں نے دکتور محمود سے کہا کہ یہ عمارت

بھی ہنر مندی کا اعلیٰ نمونہ ہے۔انھوں نے جواب دیا کہ یہ عمارت تیونس کے شہر القیر وان کی جامع مسجد عقبہ بن نافع دارلحکومت تونسیہ کی جامع مسجد الزیتونہ سے بڑی حد تک مماثلت رکھتی ہے۔دکتور محمود سے عقبہ بن نافع کا نام سنا تو جیسے ایمان تازہ ہو گیا۔کیا کمال کے انسان تھے۔ حضرت امیر معاویہؓ کے دور میں افریقہ کے گورنر مقرر ہوئے۔افریقہ میں اسلام کی جڑیں اور مزید مضبوط کرنے کے لیے ان کو خیال آیا کہ یہاں اسلامی عساکر کے لیے چھاؤنی اور مسلمانوں کے لیے ایک خوبصورت شہر آباد ہو۔اس حوالے سے عمرانیات، حربیات اور جغرافیے کے ماہرین سے مشورے کیے جس جگہ کا انتخاب کیا وہاں ایک خوفناک اور گھنا جنگل تھا جو موذی زہریلے حشرات الارض اور درندو چرند کا مسکن تھا۔حضرت عقبہ بن نافع کے لشکر میں اٹھارہ صحابی موجود تھے۔آپؓ نے بھی اُن برگزیدہ صحابہؓ کو جمع کیا اور اس گھنے جنگل میں لے گئے پھر بآوازِ بلند اعلان فرمایا کہ اے درندو اور موذی جانورو! ہم اللہ کے آخری رسولؐ کے صحابہ ہیں اور ہم اس جگہ ایک بستی بسانا چاہتے ہیں لہٰذا تم سب یہاں سے نکل جاؤ ورنہ ہم تم کو قتل کر دیں گے۔اعلان ہوتے ہی سارے درندے اور حشرات غول در غول اس جنگل سے نکلنا شروع ہوئے،شیر اپنے بچوں،بھیڑیئے اپنے پلوں،سانپ سنپولیوں کو اٹھائے جنگل سے جوق در جوق اس انداز میں نکل رہے تھے کہ حاضرین پر سکتہ طاری ہو گیا۔اس کے بعد جنگل کو کاٹ کر القیر وان کو بسایا گیا۔بلاشبہ صحابہ رسولؐ کی تعظیم و تکریم میں جنگلی درندوں اور جانوروں نے اپنے مسکن اجاڑ کر مسلمانوں کو گھر بسانے کی سہولت جس شہر کے بسانے میں دی ہو وہ مسلمانوں کے تعظیم و حرمت رکھتا ہے۔

حضرت عقبہ بن نافعؓ کی ایک کرامت بھی تاریخ کی گواہ ہے کہ افریقہ میں جہادِ اسلام زوروں پر تھا علاقوں کے علاقے فتح ہو رہے تھے تو ایک دفعہ لق و دق صحرا میں مسلمانوں کے لشکر

پر پیاس کا غلبہ ہوا اور تمام لشکر تشنگی سے مضطرب تھا۔ سپہ سالار حضرت عقبہ بن نافع گھوڑے سے اترے دو رکعات نفل پڑھی اور خدا سے پانی کے لیے دعا مانگی۔ دوران دعا آپؓ کے گھوڑے نے اپنے کھر سے زمین کریدنا شروع کی، آپؓ نے اٹھ کر دیکھا تو اس کریدی ہوئی جگہ میں پتھر نظر آ رہا تھا۔ جب وہ پتھر ہٹایا گیا تو وہاں سے ایک چشمہ پھوٹ پڑا پانی اس قدر زیادہ تھا کہ سارا لشکر اور گھوڑے سیراب ہوئے اور مجاہدین اپنے مشک بھی بھر کر روانہ ہوئے اور اس واقعے کو کون بھلا سکتا ہے جب حضرت عقبہ بن نافع شمالی افریقہ میں اسلام کا پرچم بلند کرنے کے بعد بحر اوقیانوس تک پہنچتے ہیں تو فرطِ جذبات سے اپنا گھوڑا سمندر میں ڈال کر خداوند کریم سے مخاطب ہوئے کہ اے لم یزل اگر یہ سمندر میری راہ میں حائل نہ ہوتا تو زمین کے آخری کونے تک تمھارا نام بلند کرتا چلا جاتا۔ علامہ اقبال نے اس تاریخی واقعے کو اپنی شہرہ آفاق نظم ''شکوہ'' میں یوں بیان کیا ہے۔

دشت تو دشت ہیں دریا بھی نہ چھوڑے ہم نے
بحر ظلمات میں دوڑا دیے گھوڑے ہم نے

صقلیہ سے تعلق رکھنے والے ایک فاطمی گورنر نے جامعہ الازہر کا سنگِ بنیاد رکھا اور تقریبا دو سال چار ماہ میں اس کی تعمیر مکمل ہوئی ابتدا میں اس کا نام مسجد القاہرہ تفویض کیا گیا اور کچھ عرصہ تک اسے اسی نام سے پکارا جاتا رہا بعد میں اس کا نام فاطمی حکمرانوں نے دختر رسولؐ سیدہ فاطمۃ الزہراؓ کی نسبت سے جامع مسجد الزہرا اور پھر الازہر رکھ دیا۔ ابتدا میں اس پر اہلِ تشیع کی تعلیمات غالب رہیں مگر گیارہ سو اکہتر میں جب صلاح الدین ایوبی نے عنانِ حکومت سنبھالی تو اہلِ سنت کی تعلیمات کا دور دورہ ہوا۔ اس مسجد کے چار مینار ہیں جو الغوری، قطبی، اقبعو یہ اور کستخدا کے نام سے موسوم ہیں۔ تقریباً بیس ہزار نمازیوں کی گنجائش رکھنے والی اس مسجد کی

کشادگی تین مرحلوں میں ہوئی۔ یہاں طلبا کی بہت بڑی تعداد ہے جن میں مصریوں کے علاوہ دنیا بھر سے آنے والے طلبہ شامل ہیں، میں نے شلوار قمیض پہنے ایک چپٹی ناک والے طالب علم کو دیکھا تو کچھ اپنا اپنا سا لگا میں نے اس کے ساتھ پشتو زبان میں بات کی تو وہ پشتو سے نابلد اور شیستان کا نکلا میں نے ان سے پاکستانی طالب علموں کے بارے میں پوچھا تو کہنے لگے یہاں اچھی خاصی تعداد میں پاکستانی طلبہ پڑھتے ہیں۔نماز کے بعد مسجد کے ستون سے ٹیک لگائے علماء مختلف ٹولیوں میں بیٹھے اپنے شاگردوں کو درس دینے میں مشغول تھے۔ ہر معلم کے لیے ستون کے ساتھ ایک کرسی بھی رکھی گئی تھی جس پر اس معلم کا نام درج تھا۔مسجد اور اس میں بچھے قالینوں کی صفائی اور دھول چٹائی جدید مشینوں سے کی جارہی تھی۔مسجد کے اندر وائی فائی کے بوسٹر جگہ جگہ نصب تھے۔جیب کتروں سے ہوشیار، اپنے جوتوں کی حفاظت خود کیجیے اور اپنے موبائل فون بند کیجیے جیسے تنبیہی بورڈ اور اور اشتہات یہاں مفقود تھے۔ ہمارے قریبی ستون کے پاس ایک عالم ''و انتم الا علون ان کنتم مو منین '' پر درس دے رہے تھے۔ گفتگو اس بات پر ہو رہی تھی کہ دین و دنیا کی کامرانی تب ملے گی جب تم مومن بنو، مسافر کو اس مجلسِ علمی کی آخری صف میں جگہ ملی۔مولوی صاحب کی باتیں عربی زبان میں تھیں۔مگر دل و دماغ کو متاثر کر رہی تھیں، میں نے دل و دماغ کو ان کے وائی فائی بوسٹر سے منسلک کیا اور گھنٹہ ڈیڑھ تک اپنے روح اور جسم کے خالی انباکس کو ان کی منطقی گفتگو سے لبریز کرتا رہا۔دکتور محمود اس دوران میری عکس بندی کرنے لگے اور درس کے اختتام پر کہنے لگے یا دکتور تم بھی ''الازہری'' بن گئے مبارک ہو۔میں نے کہا کاش ایسا ہوتا۔''الازہری'' بننا بہت بڑا اعزاز ہے مگر میں نے ایسے الازہری بھی دیکھے ہیں جو لاالہ کی نہ خبر گیری رکھتے ہیں اور نہ اپنے آپ کو مسلمان کہنے پر لرزتے ہیں وہ صرف نام کے الازہری ہیں ایک دانا نے کیا اچھی بات کی ہے

کہ جامعاتی اور رسمی تعلیم کا حکمت و دانش سے کوئی علاقہ نہیں۔فکر و نظر کا بھی تعلیمی اسناد سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔سند یافتگی اور ہنر کاری کی منزلیں جدا ہیں۔درسی تعلیم کی اہمیت اپنی جگہ مگر ان منزلوں کے راستے اور ہیں،سنگلاخ اور دشوار گزار۔۔۔تلوے چھلنی ہو جاتے ہیں جسم چور چور اور لیر و لیر ہو جاتا ہے۔جسم آرام طلب ہے کسب کمال کے لیے اسے بے آرام ہونا پڑتا ہے۔ تب عزیز جہاں شوی کی منزل آتی ہے اور آدمی مڑ کر دیکھتا ہے تو حیران ہو جاتا ہے۔ذرا سی بے آرامی اور اس کا اتنا بڑا صلہ۔قدرت کتنی فیاض ہے۔انسان کتنا ناسمجھ ہے۔

براعظم افریقہ کی پہلی مسجد

براعظم افریقہ کی پہلی مسجد بھی قاہرہ میں تعمیر کی گئی تھی۔یہ مسجد فاتح مصر حضرت عمرو بن العاصؓ کے نام سے موسوم ہے۔رومیوں کو شکست دے کر اس عظیم جرنیل نے حضرت محمد ﷺ کی وہ پیشین گوئی سچ ثابت کی جو آپؐ نے جنگ خندق میں کھدائی کے دوران اس بڑے پتھر کو توڑتے وقت دی تھی جس کا توڑنا صحابہ سے ممکن نہ تھا۔خلیفہ وقت حضرت عمرؓ نے حضرت عمرو بن العاص کو یہاں کا گورنر مقرر کیا۔تقریباً گیارہ ایکڑ کے احاطے پر مشتمل یہ مسجد افریقہ کی بڑی اور وسیع ترین مساجد میں شمار ہوتی ہے۔ابتدا میں یہ ایک چھوٹی سے مسجد تھی جو اسلام کی پہلی مسجد،مسجد قبا کی طرح کھجور کے درختوں پر تعمیر ہوئی تھی۔مگر اب یہ ایک عالی شان مسجد ہے جس کو دیکھنے دنیا بھر کے سیاح آتے ہیں۔

مارجرجس،مفارہ،مریمؑ اور موم بتی

مسجد عمرو بن العاص کے قریب ہی ایک پرانا کلیسا مارجرجس ہے جو اپنی قدامت اور طرزِ تعمیر کی وجہ سے نہ صرف عیسائی بلکہ مسلم،یہودی اور دوسرے مذاہب کے زائرین اور

سیاحوں کو بھی اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔ مارجر جس سے منسوب کنویں کو عیسائی مقدس مانتے ہیں، اطمینانِ قلب کے لیے ایک یادگار بھی یہاں بنی ہے جہاں زائرین موم بتیاں جلاتے ہیں۔ اس کلیسا کے ساتھ ہی ایک اور کلیسا المفارہ ہے جو دو عیسائی پیشواؤں سرجیوس اور باخس کی یاد میں تعمیر کیا گیا ہے۔ یہاں حضرت عیسیٰؑ کے ان دونوں پیروکاروں کو قتل کر دیا گیا تھا۔ المفارہ کے صدر دروازے پر ایک بڑا بورڈ آویزاں ہے جس پر اس سفر کا نقشہ کھینچا گیا ہے جس کے بارے دعویٰ ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش کے بعد حضرت بی بی مریم نے فلسطین کے اس وقت کے بادشاہ کے خوف سے کیا تھا۔ دس سال مصر میں جلا وطنی کے بعد واپسی کے سفر میں جن جن راستوں مقامات سے ہو کر بی بی مریمؑ گزری تھیں نقشے میں انھیں واضح کیا گیا ہے۔ مسافر کو بی بی مریمؑ کے اس سفر اور نقشے میں موجود سفری لکیروں نے تاریخ کی ورق گردانی کی جانب راغب کیا کہ آیا حضرت بی بی مریمؑ نے واقعی یہ سفر کیا تھا یا عیسائی زائرین کو تاریخ اور حقائق سے دور رکھ کر صرف سیاحت کے فروغ کی خاطر یہاں ایک مذہبی کشش پیدا کرنے کے لیے کہانی گھڑی گئی ہے۔

اس حوالے سے جامعہ کراچی کی تاریخ کی پروفیسر اور کئی کتابوں کی مصنفہ ڈاکٹر نگار سجاد ظہیر کی رائے معتبر لگی۔ وہ لکھتی ہیں کہ مسلم مورخین کے مرتب کردہ تاریخی بیانیے کے مطابق حضرت مریمؑ ہیکل سلیمانی کے ایک متولی عمران کی بیٹی تھی۔ عمران کی بیوی حنہ بنت فاقود ایک عمر رسیدہ اور بانجھ خاتون تھیں۔ ایک بار حنہ نے ایک پرندے کو دیکھا جو اپنے بچے کی چونچ میں کھانا ڈال رہا تھا۔ ان کے دل پر چوٹ لگی اور منت وزاری سے بارگاہ ایزدی میں اولاد کے لیے دعا مانگی۔ دعا قبول ہوئی حنہ کو بڑھاپے میں حمل ٹھہرا۔ انھوں نے شکر گزاری کے طور پر نذر مانی کہ وہ ہونے والے بچے کو بیت المقدس کی خدمت کے لیے وقف کر دیں گی۔ قرآن

کی سورۃ العمران کی آیت پینتیس بھی اس بیانیے کی تصدیق کرتی ہے۔اللہ نے حنہ کو بیٹی سے نوازا۔انھوں نے بیٹی کا نام مریم یعنی خدمت گزار خادمہ رکھا اور بیت المقدس کے متولیوں کے حوالے کیا۔بچی شیر خوار تھی تو کفالت کا مسئلہ پیش آیا، ہر متولی کی خواہش تھی کہ وہ چند ماہ قبل فوت ہو جانے والے عمران کی اس بچی کی کفالت اپنے ہاتھوں میں لے۔قرانداز ی ہوئی تو فال حضرت زکریاؑ کے نام نکلا جو معصوم مریمؑ کے خالو بھی تھے۔جب حضرت مریمؑ سنِ رشد کو پہنچیں تو ہیکل کے محراب میں معتکف ہو گئیں، جب کبھی حضرت زکریاؑ ان کی خبر گیری کے لیے جاتے اور ان کے پاس کھانے پینے کی اشیاء دیکھتے تو تعجب سے پوچھتے کہ یہ چیزیں کہاں سے آئی ہیں۔حضرت مریمؑ جواب دیتیں اللہ کے پاس سے۔۔۔''وہ جسے چاہے بے حساب رزق دیتا ہے'' حضرت مریمؑ (جن کی عفیفگی اور پاکبازی کی گواہی قرآن میں ہے) کے پاس ایک بار فرشتہ آیا اور انھیں بیٹے کی خوش خبر دی تو معصوم مریمؑ ششدر رہ گئیں۔فرشتے نے نام بتایا کہ اس کا نام مسیح ابنِ مریمؑ ہو گا اور اللہ کے مقرب بندوں میں سے ہو گا اور لوگوں کے ساتھ گہوارے میں بھی کلام کرے گا۔

حضرت عیسیٰؑ کی معجزانہ ولادت کا وقت قریب آیا تو حضرت مریمؑ ایک دور دراز مقام پر چلی گئیں۔زچگی کی تکلیف اوپر سے بھوک پیاس اور تنہائی سے بے چین ہوئیں تو کہنے لگیں کاش میں اس سے پہلے مر جاتی اور نام ونشان مٹ جاتا مرا۔ایسے میں ایک فرشتہ ان کے پاس آیا تسلی دی، جس کھجور کے درخت کے نیچے بیٹھی تھیں اس کی شاخیں ہلائیں تو پکی کھجوریں ٹپک پڑیں اور قریب ہی سنگلاخ پتھروں سے شفاف پانی کا چشمہ ابل پڑا۔بیٹے کی پیدائش کے بعد حضرت مریمؑ کا اپنے علاقے میں آنا لوگوں کا اظہارِ نفرت کرنا حضرت مریمؑ کا خاموش رہنا اور حضرت عیسیٰؑ کا گہوارے سے گویا ہونا کہ ''میں اللہ کا بندہ ہوں، اسی نے مجھے کتاب دی اور نبی

بنایا، مجھے بابرکت کیا، جہاں بھی رہوں۔ زندگی بھر کے لیے نماز اور زکوۃ کی پابندی کا حکم دیا اور اپنی والدہ کا حق ادا کرنے والا بنایا اور مجھ کو شقی نہیں بنایا۔ سلام ہو مجھ پر جبکہ میں پیدا ہوا اور جبکہ میں مروں اور جب کہ میں زندہ کر کے اٹھایا جاؤں''

بہ قول نگار سجاد ظہیر مسلم مؤرخین کا یہ بیانیہ اس بات پر منتج ہوتا ہے کہ گہوارے سے حضرت عیسیٰ ؑ کی گفتگو سے یہودی علماء مطمئن ہو گئے اور حضرت مریم ؑ ہیکلِ سلیمانی میں دوبارہ متعکف ہو گئیں۔ جب حضرت عیسیٰ ؑ تیس برس کے ہوئے اور انھوں نے یہودی حکمرانوں کی غلط کاریوں پر گرفت شروع کی تو حکمرانوں نے بدلے میں حضرت مریم ؑ پر زنا کا بہتان دھرا اور تاریخ سے کھلواڑ شروع کیا۔ حضرت مریم کے اخلاقی اور روحانی مرتبے کو گھٹا کر بداخلاقی کی داغ بیل ڈالی اور حضرت عیسیٰ ؑ کی گہوارے کی گفتگو سے منکر ہوئے۔ یہودیوں کی حضرت عیسیٰ ؑ سے بغض اور عداوت تو فطری تھی کہ انھوں نے نبوت کا اعلان کر کے دین عیسوی کی بنیاد رکھی مگر حیرت ہے کہ نصرانیوں نے اسرائیلیات کو رد کرنے کی بجائے ان میں مزید اضافہ کیا اور کہانیاں گڑھیں کہ بہتان کے خوف سے بی بی مریم فلسطین سے مصر چلی گئیں اور وہاں دس برس مقیم رہیں۔

اس کلیسا کی تاریخی حیثیت بلا شبہ غلط روایات پر مبنی ہے مگر ان کے نام پر بنے اس کلیسا کی عمارت کی دلکشی اور تعمیراتی خوبصورتی دیدنی ہے۔ اس کو معلق کلیسا بھی کہا جاتا ہے جو صرف دیواروں پر کھڑا ہے نہ ہی اس کی بنیادیں ہیں اور نہ ہی چھت کے سہارے کے لیے کوئی گہرائی اور گیرائی والے ستون۔ میں نے دکتور محمود کو کہا کہ قدرت نے بی بی مریم کی پاک دامنی کے اشارے اس کلیسا کی تعمیر میں بھی دیے ہیں جس طرح فلسطین سے مصر ہجرت کی اس جھوٹی روایت کا نہ سر ہے نہ پیر ویسے ہی اس عمارت کی بنیادیں ناپید ہیں۔ کلیسا کے صدر دروازے سے داخل ہوں تو ایک خوبصورت صحن آپ کا استقبال کرتا ہے جہاں فن بائبل کی دلکش ہنروری

دیکھی جاسکتی ہے۔صحن سے تقریباً انتیس سیڑھیوں کی بلندی پر واقع اس کلیسا کی تعمیر کے متضاد دعوے ہیں۔ایک روایت ہے کہ یہ عمارت چھ سونوے عیسویں کی تعمیر ہے بعض روایات کے مطابق اسے دوسری اور تیسری صدی عیسوی میں تعمیر کیا گیا۔یہ بھی کہا جاتا ہے کہ پوپ ابراہیم نے نوسواسی عیسوی میں اس کو دوبارہ تعمیر کیا۔اس کلیسا کی چھت الٹی رکھی کشتی کی مانند نظر آتی ہے کلیسا کے اندر بی بی مریمؑ،حضرت عیسیٰؑ اوران کے حواریوں کی شبیہیں خوبصورت چوکھٹوں میں آویزاں ہیں۔ماربل اورمختلف رنگوں کے گرینائیٹ سے مزین اس کلیسا کی دلفریبی اپنی مثال آپ ہے۔

مسجد حسین

مسجد الازہر شریف اور مسجد حسین کے درمیان ایک بڑی شاہراہ ہے ہم نے اس بڑی شاہراہ کو مشکل سے عبور کیا، کیونکہ یہاں گاڑیوں کا رش انتہا پر تھا۔عشا کی نماز کے لیے ابھی کچھ وقت باقی تھا۔مسجد حسین کے میناروں پر لگے لاؤڈ سپیکروں سے خوش الحان قاری کی تلاوت کی آواز کانوں کو بھلی لگ رہی تھی۔جوں ہی قاری آیت کے خاتمے کے بعد سانس کی بحالی کے لیے وقفہ لیتا تو ساتھ بیٹھے سامعین داد کے طور پر بلند آواز سے ''اللہ'' پکارتے۔دکتور محمود نے بتایا کہ یہ ایک تاریخی مسجد ہے یہاں امام عالی مقام حضرت امام حسینؑ کا سر مبارک دفن کیا گیا ہے۔یہاں دنیا بھر سے اہلِ تشیع زیارت کے لیے آتے ہیں۔اس مسجد کی انفرادیت یہ بھی ہے کہ قاری عبدالباسط اور کئی دوسرے قرأ یہاں نماز سے پہلے تلاوت کرتے اور سامعین سے داد وصول کرتے رہے ہیں یہ روایت آج بھی قائم ہے۔امام حسینؑ کے سر مبارک کے حوالے سے جب اہلِ تشیع دوستوں سے تصدیق کی تو معلوم ہوا کہ صرف شیعہ فرقے داؤد بوہری کا یہ دعویٰ ہے باقیوں کا نہیں۔قبلے کی طرف منبر سے دائیں جانب ایک بڑے ہال میں چاندی کی جالیوں سے سر اقدس والی جگہ کو ڈھانپا گیا ہے۔زائرین اس کے گرد چکر لگا رہے تھے بعض وہاں نوافل پڑھ رہے

تھے۔ یہاں مکمل مسلکی آزادی تھی۔کوئی شیعہ کافر،کوئی سنی کافر کی آوازیں نہ تھیں۔چند مخیّر حضرات لوگوں میں نیاز تقسیم کررہے تھے۔مجھے بھی ایک سخی نے کھجور،ٹافیوں اور چاکلیٹ کے پیکٹ تھمادیے۔

مسجد حسین ایک کشادہ مسجد ہے نمازِ عشاء کے لیے جب جماعت کھڑی ہوئی تو میرے خیال کے برعکس پوری مسجد اور باہر کا دالان نمازیوں سے بھر گیا سنی امام کے تتبع میں بوہری اہلِ تشیع بھی نماز میں شامل ہوگئے،مسجد کی دیواروں پر لگے ماربل کے تختوں پر احادیث رسولؐ جگہ جگہ درج تھیں۔''حسین مجھ سے ہے اور میں حسین سے'' والی حدیث ایک نمایاں جگہ پر درج تھی۔اس مسجد کا تخصص یہ بھی ہے کہ مصر کی ہر مسجد میں غیر مسلم جاسکتے ہیں مگر اس مسجد میں ان کا داخلہ ممنوع ہے۔

خان الخلیلی بازار

مسجد حسین کے باہر دالان میں بڑی تعداد میں ریستوران موجود ہیں جہاں کھلی فضا میں سیکڑوں میز اور کرسیاں لگیں تھی۔چند مصری نوجوان گٹار بجارہے تھے باقی لوگ محظوظ ہورہے تھے۔نماز کے وقت موسیقی بند تھی۔دکتور محمود نے کہا یہ ذہنی ہم آہنگی مصری قوم کا خاصہ ہے وہ ایک دوسرے کو بہ زور نہیں روکتے۔مذہب اور محبت ہم مصریوں کی گھٹی میں ہے مگر ہم اس کے ذریعے ایک دوسرے کو جنت یا جہنم رسید نہیں کرتے۔ہم جیو اور جینے دو کے اصولوں پر زندگی گزارتے ہیں۔محمود کی گفتگو میرے دل میں ترازو ہورہی تھی۔میری فکر جیو اور جینے دو کے آفاقی اصول کو پاکستانی معاشرے میں ٹٹول رہی تھی،مگر میری یہ تلاش بے سود تھی۔مذہبی دھڑے بندیوں،قوم پرستی،لسانی تفاوت،علاقائی بغض اوپر سے حکمران طبقے کی اس ملک اور عوام کے ساتھ چیرہ دستیوں نے پاکستانی معاشرے سے ان دونوں اصولوں کو ناپید کردیا ہے۔مسافر اس سماجی اور مذہبی تخریب پر اپنی سوچوں میں غلطاں تھا جو نائن الیون کے بعد پاکستانی سماج میں انتہا کو پہنچی کہ اس دوران چہل قدمی کرتے کرتے ہم مسجد حسین سے اچھا خاصا فاصلہ

طے کر چکے تھے اچانک دکتور محمود نے کہا کہ ہم خان الخلیلی بازار میں کھڑے ہیں۔فکری پرواز سے زمینی حقائق کی طرف پلٹے تو اپنے آپ کو ایک تنگ مگر مصروف بازار میں پایا۔چودھویں صدی کے اواخر میں ترک عثمانی دور میں بننے والے اس بازار کا پرانا نام ''ترکی بازار تھا'' جو بعد میں خان الخلیل کے نام سے مشہور ہو گیا۔مجھے اس بازار میں لاہور کی انارکلی اور بنکاک کی نانا سٹریٹ کی شبیہ نظر آئی جہاں ہجوم کی حالت یہ تھی کہ ''نظر چرا کے چلے جسم و جاں بچا کے چلے'' والی کیفیت بنی تھی۔یہاں زیورات، پرانے دور کے فرنیچر، آلاتِ موسیقی، قالین اور کپڑوں کی دکانیں، چمڑے کی بنی اشیاء تانبے اور جست سے بنے برتن، عطر فروشوں کی دکانیں لوگوں کو اپنی طرف کھینچ رہی تھیں۔دکتور محمود نے کہا جب سے یہ بازار وجود میں آیا ہے کبھی بند نہیں ہوا دن ہو یا رات بازار کھلا رہتا ہے۔خان الخلیلی بازار میں قہوہ خانوں اور حقے شیشے کی دکانیں زیادہ آباد تھیں۔پورا بازار جب گھوم کر تھکن بڑھ جائے تو یہاں حقہ دخانی اور قہوہ پانی سے لوگ سواد اٹھاتے ہیں۔دکانوں کے باہر تھڑوں پر بوڑھے مصری براجمان شیشے کے 'سوٹے'' لگاتے بازار میں آئے سیاحوں کے ساتھ مسکراہٹوں کے تبادلے کرتے دکھائی دیتے ہیں۔اکثریت کی خواہش ہوتی ہے کہ باہر سے آئی کوئی گوری میم اس کے پہلو میں بیٹھ کر اس کے حقے سے دو تین کش لگائے۔مغرب سے آئی گوری میمیں جب مصری بابوں کی اس ''گڈ آفر'' سے محظوظ ہو کر ان سے گہرا معانقہ کرتی ہیں تو بابوں کی آنکھوں کی چمک اور چہرے کی بشاشت دیدنی ہوتی ہے۔

مسافر نے دکتور محمود سے پوچھا کہ مصر کا وہ بازار کہاں ہے جہاں غلام فرخت ہوتے تھے جہاں حضرت یوسفؑ کی بھی فروخت ہوئی تھی۔کہنے لگے وہ بازار تاریخ کی کتابوں میں مل سکتا ہے مگر عصرِ حاضر کے مصر میں اس بازار کا کوئی پتہ نہیں، اس نے کہا عصر حاضر کو چھوڑیں موسیٰؑ کے فرعون کو بھی معلوم نہ تھا کہ ان سے پہلے مصر کے ایک بادشاہ حضرت یوسفؑ نام کے

کوئی شخص بھی گزرے ہیں۔خان الخلیلی کی دکانوں کی پشت پر رہائشی گھر تھے۔مکانات اور دکانیں آپس میں اس انداز میں پیوست ہو گئے تھے کہ تفریق مشکل تھی۔ان کے بیچوں بیچ کیفے تھے جہاں رقص وسرود کی محفلیں جمتی تھیں۔مصری رقص کو عربوں میں بالخصوص اور باقی دنیا میں بالعموم شہرت حاصل ہے۔مصری حسینائیں جسم کے انگ انگ کو ساز و آواز کے ساتھ کمال ربط سے حرکت دیتی ہیں ۔ جوشؔ ملیح آبادی نے رقص کو اعضا کی شاعری کا نام دیا ہے مصری حسیناؤں کا رقص اس کا بیّن ثبوت ہے۔دکتور محمود نے مجھ سے پوچھا کہ پاکستانی معاشرے میں بھی رقص پسند کیا جاتا ہے؟ میں نے پاکستانی اور ہندوستانی فلموں میں رقص دیکھے ہیں۔میں نے ہنس کر کہا آپ نے برا رقص دیکھا ہے۔اس رقص کے بارے میں پیر و مرشد مشتاق احمد یوسفی نے اپنی کتاب شامِ شعر یاراں میں اچھی گفتگو کی ہے وہ لکھتے ہیں کہ یونہی خیال آیا کہ ''رقص'' عربی زبان کا لفظ ہے ذرا لغت میں اس کے معنی تو دیکھیں۔بعض اوقات لغت دیکھنے سے بھی نیا شوشہ یا شگوفہ ہاتھ لگ جاتا ہے۔اس لفظ کے معنی ہیں اونٹ کی اچھلتے اور کودتے ہوئے دوڑ گویا شتر مع شترغمزوں کے۔حیرت ہوئی کہ جس عرب نابغہ روزگار نے یہ لفظ ایجاد کیا اس نے ہزاروں برس بیشتر پوپ راگ اور رقص کی ایسی رئیلسٹک تصویر کھینچ کے رکھ دی کہ جس قدر اش اش کریں کم ہے۔جس قسم کے ڈانس اور جس قماش کے ڈانسر آج کل چینلز پر دکھائے جا رہے ہیں ان میں جسم کا صرف ایک حصہ استعمال کیا جاتا ہے۔

یوسفی لکھتے ہیں کہ ہر جذبے اور ہر ایسی خواہش کا اظہار و اعلان جس سے گھر بگڑے،اب صرف کولھوں کے ذریعے کیا جاتا ہے۔ہم تو بچپن سے یہی سنتے اور سمجھتے آئے تھے کولھے صرف بیٹھنے، پتلون کو پھسلنے سے باز رکھنے اور اسکول میں بید لگوانے کے لیے بنائے گئے ہیں۔اب تو یہ دیکھا کہ پوری ایموشنل رینج یعنی جذبات کی ساری سرگم کولھوں سے اس طرح ادا کی جاتی ہے کہ

کیا بتائیں دل پر چھری سی چل جاتی ہے۔ مٹکے مٹکانے اور ٹھمکا لگانے یعنی Hip swing اور Wiggling کو فنونِ لطیفہ کا درجہ دینے کا کریڈٹ ان چینلز کو جاتا ہے۔

پاکستانی رقص، ڈونلڈ ٹرمپ اور مرشد یوسفی

میں نے دکتور محمود سے کہا کہ پاکستان میں مختلف زبانوں اور رسم و رواج کے لوگ آباد ہیں۔ اس لیے وہاں ایک نہیں بلکہ کئی طرح کے رقص ملتے ہیں۔ پنجاب میں بھنگڑا، لڈی، سمی اور گدا وغیرہ شامل ہیں۔ اسی طرح بلوچی چاپ، جھومر اور لیوا رقص کرتے ہیں۔ سندھی تہذیب میں دھمال اور ہوجمالو کا بہت زیادہ رواج ہے چونکہ سندھ صوفیا کی سرزمین ہے اس لیے ان کے مزاروں پر دھمال ڈالی جاتی ہے۔ جس میں وجد کی حالت میں مدھم سروں پر رقص کیا جاتا ہے۔ اس طرح پختونخواہ میں اتن خٹک اور چترالی وگلگتی رقص کو رواج ہے۔ خٹک رقص تلواروں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ دکتور محمود نے کہا عرب میں بھی تلواروں کے ساتھ رقص کیا جاتا ہے۔ میں نے کہا جی بالکل میں نے سعودی شاہ سلمان کے ساتھ امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ کو یہ رقص کرتے دیکھا ہے۔ اس پر دکتور محمود نے خوب قہقہہ لگایا کہنے لگے اس میں ٹرمپ وہی لگ رہے تھے جس کا ذکر آپ کے مرشد یوسفی نے لغت میں دیکھا تھا۔

میں نے دکتور محمود کو مخاطب کیا کہ آپ کو معلوم ہے پاکستان کے شمال میں کیلاش قوم آباد ہے جو بالکل منفرد تہذیب اور الگ تھلگ بود باش کے لوگ ہیں۔ ان کی خواتین خوبصورت زرق برق لباس زیب تن کیے سروں پر خوبصورت مالا پروئے ٹوپیاں پہنے، کندھے سے کندھا ملائے ڈھول کی تھاپ کے ساتھ مدھم انداز میں ٹو اینڈ فرو موشن میں رقص کرتے ہیں، مگر حیرت کی بات یہ ہے کہ جب یہ لوگ اپنے مردے دفناتے ہیں تب اس رقص کا خوب اہتمام کیا جاتا ہے۔ اس نے حیرت سے پوچھا کہ تدفین کے وقت یہ رقص کیوں؟ میں نے کہا ان کا عقیدہ

ہے کہ مردہ خوشی خوشی رخصت کیا جائے تو اس کی روح کو سکون ملتا ہے۔اس رقص کے دوران وہ شراب پیتے ہیں اور خوشی کے گیت گاتے ہیں۔میں نے کہا پاکستان اور ہندوستان میں ایک اور رقص بھی معروف ہے جس کو کتھک کہتے ہیں۔یہ سنسکرت لفظ ہے جس کا مطلب ہے کہانی اور قصہ بیان کرنا۔اس رقص میں کسی واقعے یا قصے کو اعضا کی حرکات وسکنات میں بیان کیا جاتا ہے۔

جامعہ الازہر میں اردو شناسی

مصر میں ہمارا آخری پڑاؤ جامعہ الازہر تھا۔میرے خیال میں مصر کی تاریخ جامعہ الازہر کے بغیر نامکمل ہے۔دس لاکھ بشمول پچاس ہزار غیر ملکی طالب علموں کی علمی آبیاری کرنے والے اس ادارے کو دیکھنا اور وہاں کے اساتذہ اور طلبہ سے مصاحبہ اور مکالمہ کرنا مسافر کی بڑی آرزو تھی۔پوری مسلم امہ میں شاید یہ واحد بڑی درسگاہ ہے جہاں لگ بھگ سات درجن شعبہ جات میں دینی اور دنیوی علوم کی تدریس ہوتی ہے۔میں نے دکتور محمود سے پوچھا کہ کون سے بڑے علوم ہیں جو یہاں پڑھائے جاتے ہیں۔انھوں نے برجستہ کہا سارے علوم۔انھوں نے پھر وضاحت کی کہ دینی علوم تو ہیں سارے اس کے علاوہ ہندسہ،طب،معاشیات،بنکاری،تجارت، تاریخ،تصوف،ادب،ارضیات،عمرانیات،تہذیب اور سائنس غرض بہت سارے علوم ہیں۔ دکتور محمود نے علم وفنون کا طویل پہاڑا ایک سانس میں سنا دیا۔میں نے ان سے پوچھا کہ اس طویل فہرست میں آپ نے اس شعبے کا نام نہیں لیا جہاں جانا میری خواہش ہے۔ہنس کر کہنے لگے ''اردو''۔جی بالکل جامعہ الازہر ہی نہیں بلکہ مصر کی چھے سات جامعات میں شعبہ اردو ہے۔

ہم جامعہ کے صدر دروازے سے داخل ہوئے جس پر جلی حروف میں ''جامعہ الازہر فرع البنات'' لکھا تھا گیٹ پر ضروری سیکورٹی کلیرنس کے بعد ہمیں شعبہ اردو کی طرف جانے کی اجازت دے دی گئی۔ہم شعبہ اردو کی طرف جا ہی رہے تھے کہ ایک طالبہ دوڑتی ہوئے

ہمارے پاس آئی اور عربی آمیز اردو لہجے میں مخاطب ہوئی کہ ''آپ لوگ پاکستان سے آئے ہیں؟'' دکتور ابراہیم اپنے دفتر میں آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔'' ہم ان کے ساتھ ہو لیے اور صدر شعبہ کے دفتر میں داخل ہوئے۔ ویسے تو فیس بک اور ادبی کانفرنسوں کی وجہ سے پروفیسر ابراہیم محمد ابراہیم کی شکل وصورت سے شناسائی تھی مگر یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ ابراہیم صاحب اچھے خاصے بزلہ سنج اور شستہ اردو بولنے والے مصری ہیں۔ ابراہیم صاحب نے ہمیں قدرے کشادہ دفتر میں کشادہ دلی اور خندہ پیشانی سے خوش آمدید کہا۔ ان کا دفتر بہت ساری کتابوں، رسالوں، چھوٹی چھوٹی تپائیوں اور تو اور عربی زبان کی کتابوں سے بھری چند الماریوں سے بھرا پڑا تھا جن پر ''گوشہ مصر و پاک دوستی'' تختی لگی ہوئی تھی۔ ہم ان کی یونیورسٹی میں دیر سے پہنچے اور اکثر طالبات چھٹی کر کے رخصت ہو چکی تھیں مگر سال اول کی چند طالبات کو انھوں نے روک رکھا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے شعبے کے طالب علموں سے میرا تعارف کرایا پھر باری باری طالب علموں سے اردو زبان میں تعارف کروایا۔ شاہندہ سعید، شہد سعد، ایمان اور دوسری کئی طالبات کی زبانی عربی لہجے میں ترتیلی اردو سن کر بے حد خوشی ہوئی۔ ایک سینئیر طالبہ ڈاکٹر ابراہیم کے قریب بیٹھی ہوئی تھی اس کے بارے میں بتایا گیا کہ یہ پاکستان کے شاعر ابدال بیلا پر پی ایچ ڈی کر رہی ہیں۔ میں نے ان کو بتایا کہ اس موضوع پر ہمارے شعبۂ اردو ہزارہ یونیورسٹی سے ایم فل کی سطح کا تحقیقی کام ہو چکا ہے۔ جامعہ الازہر کا یہ حصہ صرف خواتین کی تعلیم کے لیے مختص تھا۔ دکتور ابراہیم اس شعبے کے سربراہ تھے۔ ڈاکٹر صاحب سے بے تکلفی ہوتی تو ان سے پوچھتا کہ ''محترم یہ آپ کی مردانگی پر عدم اعتماد کا اظہار نہیں؟'' اردو ادب سے ان کی محبت اور مصر میں اردو کے فروغ کے لیے ان کی خدمات بلاشبہ کسی سے پوشیدہ نہیں اس کے ساتھ ساتھ ان کی پاکستان دوستی بھی قابل داد ہے۔ یہ روشن دماغ اور کشادہ جبین انسان پاکستان اور پاکستانیوں

کے لیے انتہائی اچھے جذبات اور نیک خواہشات رکھتے ہیں۔حکومت پاکستان نے ان کی پاکستان دوستی کے صلے میں انھیں پاکستان کے اعلیٰ سول اعزاز ستارہ پاکستان سے نوازا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کی کرسی کے پیچھے ''وما توفیقی الا باللہ'' کی خوبصورت تحریر ایک فریم میں آویزاں تھی۔فریم کے اطراف میں اردو زبان وادب کے مشاہیر الطاف حسین حالؔی، اشفاق احمد، احمد ندیم قاسمی، پروین شاکر اور چند دوسرے اردو ادبا کی تصاویر مالا کی طرح لٹکی ہوئی تھیں۔ڈاکٹر صاحب نے ایک طالبہ کی طرف اشارہ کیا کہ یہ فاطمہ بدرالدین ہیں یہ اگلے ماہ بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی ملتان چھے مہینوں کے لیے اپنی اردو مزید نکھارنے اور رواں بنانے کے لیے جائیں گی۔ میں نے کہا فاطمہ کو وہاں بھی گھر جیسا ماحول ملے گا۔لوگ تو ہیں ہی اچھے۔مگر ماحول بھی قاہرہ ہی کی طرح ملے گا۔ملتان شہر جو چار ''گ'' گرد و گرما گداو گورستان کے لیے مشہور ہے۔میں نے وہ چیزیں قاہرہ میں بھی دیکھی ہیں۔فاطمہ کو تو شاید میری گفتگو سے پتا نہیں چلا کہ کیا کہہ رہا ہوں مگر ڈاکٹر ابراہیم نے اس پر خوب قہقہہ لگایا۔

جہاں گرد کی واپسی

مسافر قاہرہ کے ہوائی مستقر پر کھڑا اجازت لے رہا تھا۔وقتِ رخصت ان کی آزردہ دلی مجھ سے دیکھی نہیں جا رہی تھی وطن واپسی کے لیے جہاز کے اڑان بھرنے سے چار گھنٹے پہلے مجھے ائیر پورٹ پہنچنا تھا۔میں دو گھنٹے مزید پہلے پہنچا تھا۔دکتورہ بسنت، احمد صاحب،، دکتور علی، دکتورہ شائمہ اور باقی سارے دوستوں کے ساتھ مصر میں چھے دن اس قدر مصروف کہ وقت بیتنے کا احساس ہی نہیں ہوا اور اب رخصتی کے یہ چھے گھنٹے جیسے رک سے گئے ہیں۔ سب کی محبت اور آنسوؤں سے لبریز آنکھیں میرا راستہ روک رہیں تھیں۔دکتورہ بسنت کا ''پھر کب آؤ گے'' والے سوال سے میرا پیچھا چھڑانا مشکل تھا۔دکتورہ شائمہ کا مشورہ کہ ''نیل کا

پانی پی کر جاؤ جس نے بھی پیا واپس ضرور آیا'' مصر سے میرے تعلق اور مراسم کے ایسے کچے دھاگے ہیں جن کی مضبوط گرفت سے خود کو آزاد کرانا مشکل ہو رہا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اہل مصر بے وفا ہوتے ہیں، خود غرض ہوتے ہیں، حسب ضرورت و سہولت مراسم رکھتے ہیں مگر میں نے مصر اور اہل مصر کو وفادار انسان دوست اور ملنسار پایا۔ اگر اہل مصر وفا شعار اور انسان دوست نہ ہوتے تو بازارِ مصر میں فروخت شدہ اور زندانِ زاویرا میں مقید رہنے والے حضرت یوسفؑ اپنے والد حضرت یعقوبؑ اور اپنے اہل و عیال کو کنعان سے مصر مستقل سکونت کے لیے کیوں بلاتے۔ قاہرہ ائیر پورٹ کی انتظار گاہ کی کھڑکی سے روشن چاند واضح نظر آ رہا تھا یوں لگ رہا تھا جیسے وادی سینا کے عقب سے چاند نے مصر کو منور کرنے کے لیے اپنے دودھیا اجالے کی پھوار پھینکی ہو۔ میں چشمِ تخیل سے ساحلوں، ٹیلوں، وادیوں اور پر شکوہ عمارات پر چاند کی نقرئی کرنوں کو محسوس کر رہا تھا۔ مصر داستانوں اور افسانوں کی سرزمین ہے۔ یہاں نفرتیتی، زلیخا اور قلوپطرہ آج بھی شائمہ، بسنت، ایمان اور شاہندہ کی شکل میں حسن اور فسوں گری کی ضو پاشی کرتی نظر آتی ہیں۔ یہاں یوسفؑ، موسیٰؑ اور ہارونؑ جیسے برگزیدہ ہستیوں کی عظمت رفتہ اس مقدس قیدار کو قید زماں سے آزادی دلاتی ہے۔ مسافر قاہرہ کے ہوائی مستقر کی انتظار گاہ میں بیٹھا واپسی کے لیے باندھے گئے اپنے رختِ سفر سے پانی کی سبز بوتل نکالتا ہے اور نیل کا پانی غٹا غٹ پینے لگتا ہے۔

ناقدین کی آراء

نیل کے سنگ سنگ

پروفیسر غضنفر علی

(جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی، ہندوستان)

کچھ لوگ دیکھی ہوئی دنیا کو بھی ٹھیک سے دیکھ نہیں پاتے کہ وہ نگاہوں میں آتی تو ہے مگر پتلیوں سے نکل جاتی ہے۔ مگر کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں کہ دنیا کو خود تو جی بھر کر دیکھتے ہی ہیں، اپنی دیکھی ہوئی اس دنیا کو دوسروں کی آنکھوں میں بھی منتقل کر دینا چاہتے ہیں۔ ان کی اس چاہ کے پیچھے منشا یہ ہوتا ہے کہ وہ دنیا کے رنگ و آہنگ کو ان دیدوں تک بھی پہنچا دیں جن کی نگاہیں پپوٹوں کے اندر بند رہتی ہیں اور پلکوں کی چلمنوں سے کبھی باہر نہیں نکل پاتیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ ان کی طرح دوسرے بھی دیکھیں کہ دنیا کتنی حسین ہے۔ اس کی فضاؤں میں کیسی رنگینی ہے۔ اس کی ہواؤں میں کس قدر سنگینی ہے۔ اس کی اداؤں میں کیسی دل نشینی ہے۔ وہ بھی یہ منظر دیکھیں کہ جب جہاز کے جھروکوں سے جھانکتے ہیں تو منظر کیسے بدل جاتے ہیں، کیا کیا کس روپ میں ڈھل جاتے ہیں، دیکھیں کہ لمبی چوڑی عمارتیں ماچس کی ڈبیا بن جاتی ہیں، چوڑی چوڑی سڑکیں یہاں تک کہ شاہراہیں بھی سکڑ کر پگڈنڈیوں کا روپ دھار لیتی ہیں۔ اونچے اونچے پیڑ گل بوٹے دکھائی دینے لگتے ہیں، پہاڑ، دریا، گاؤں، شہر سب سفید روئی کے گالوں میں چھپ جاتے ہیں۔ آسمان قریب آجاتا ہے۔ زمین دور ہو جاتی ہے۔ سجی سنہری پھول کی مانند کھلی کھلی سی رنگین تتلیاں ٹرالیوں میں پانی کی ننھی منی پیاری پیاری سی بوتلیں اور رنگ برنگی ٹافیاں لے کر چلتی ہیں تو مسافروں کی آنکھوں میں پیار اُمڈ آتا ہے اور بنا

پیاس کے بھی ہونٹ پھڑ پھڑا اُٹھتے ہیں۔

غیر ملکی شہریوں کی حیرت انگیز رونقیں، دل فریب محفلیں، محفلوں کی چہلیں، جسموں کی زقندیں، عیش وعشرت سے سجی بستیاں اور مدمست کر دینے والی مستیاں جب آنکھوں میں آتی ہیں تو یک لخت دیکھنے والے کی دنیا ہی بدل جاتی ہے۔ قدیم عجائبات، جدید ایجادات، انسانی اختراعات، حربی آلات، تکنیکی فتوحات، مشینی آلات، جنت نشان مکانات، نئے افکار خیالات جب سامنے آتے ہیں تو خالق اور مخلوقات دونوں کی عظمتوں پر بے ساختہ لبوں سے واہ واہ اور طرح طرح کے تحسینی کلمات نکل پڑتے ہیں۔

جن لوگوں نے چاہا کہ وہ اپنی دیکھی ہوئی دنیا کو دوسروں کو بھی دکھائیں ان میں سے ایک الطاف یوسف زئی بھی ہیں۔ الطاف یوسف زئی کی دیکھی ہوئی دنیا خوب صورتی اور لطافت کو دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ وہ اسم با مسمّٰی بھی ہیں۔

ان کی پر لطف تحریر بتاتی ہے کہ وہ الطاف ہیں۔ ان کے خوش افکار اور خوش اظہار دونوں سے پتا چلتا ہے کہ وہ اپنے اندر اوصافِ یوسفی بھی رکھتے ہیں۔ اسی لیے ان کی نگاہیں دورانِ سفر ایسے مقامات پر ٹھہرتی ہیں جو اپنے وجود میں ظاہری یا باطنی کوئی نہ کوئی خوب صورتی ضرور رکھتی ہے جو کسی نہ کسی پہلو سے پُر لطف ضرور ہوتے ہیں۔ الطاف یوسف زئی کی لطافت اور وصفِ یوسفی کو ثابت کرنے کے لیے اُن کے سفر نامہ ''نیل کے سنگ'' کے مختلف حصوں سے ماخوذ یہ چند اقتباسات ہی کافی ہوں گے۔

> ''مصر والے راستوں کو اگر شاہراہِ بزرگ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ ہزار ہا سالوں سے ہزار ہا انسانوں نے اس سرزمین پر اپنے نقوش چھوڑے۔ کشادہ جبیں اور روشن خیال رہروانِ شوق نے اس سرزمین کو نسلِ انسانی کے لیے منبعِ

نور بنایا اور دلوں کو بینائی بخشی''۔

''مسافروں کی جہاز میں جلد بیٹھنے کی خواہش جس رفتار پر چل رہی تھی ،گھڑیال کی سوئیاں اس کے ساتھ قدم ملا کر چلنے سے عاری تھیں۔لمحہ موجود منجمد تھا اور شوقِ پرواز کو پر لگے ہوئے تھے''۔

''اس مسجد کی خوبصورتی بے مثال تھی۔ داغی شیشے سے بنی یہ مسجد واقعی ایک شاہکار تھی۔ یہاں برقی قمقموں کی منور روشنیاں داغی شیشے سے منعکس ہوتیں تو پرزم کی طرح کئی رنگوں کی قوسِ قزح بکھیرتیں''۔

''ایک طرف شہر کی بڑی عمارات اور فلک بوس مینار اپنی حقیقت مجھ پر آشکار کر رہی تھیں تو دوسری طرف میری پیشوائی کے لیے ایک عظیم تہذیب، ایک بزرگ تاریخ، قرآنی آیات کے عملی نمونے اور چشم کشا تفسیریں چشم براہ تھیں''۔

ان اقتباسات میں صوری اور صوتی خوبصورتی موجود ہے۔غور سے ان کے جملوں کو پڑھیں تو ان سے منعکس ہونے والا معنوی حسن بھی محسوس ہوگا۔مسافر نے اپنی رودادِ سفر کے بیان میں اس بات کی کوشش کی ہے کہ اس کا بیان پیکر بن جائے۔ بیان ہونے والا منظر دکھائی بھی دینے لگے۔اس کاوش کی ایک عمدہ مثال بھی دیکھیے :

''بقول شخصے فضا میں راستے کہاں ہوتے ہیں، صرف راستے کا احساس

ہوتا ہے۔فضا بے کراں اور بے نشاں، نہ کسی پرانے قافلے کا نقشِ قدم محفوظ، نہ کسی نئے کارواں کے لیے سنگِ میل موجودہ۔ نہ پس انداز اور نہ زادِ راہ۔فضا پاک ہے اور اس کا مرکب بہت لطیف۔اس لیے فضا میں مادہ تقریباً معدوم ہو جاتا ہے اور سمت موہوم۔صرف ایک خلا رہ جاتا ہے۔ ہر طرف خلا ہی خلا۔ ایک خلا کے بعد دوسرا خلا۔فکر کو اس کا سرا نہیں ملتا۔ پھر بھی اس خیال سے ڈھارس بندھی ہے کہ اگر خلا بسیط ہے تو کوئی محیط بھی تو ہوگا''

اس سفر نامے میں اس طرح کے بہت سارے پیکر ہیں جو پڑھنے والے کو زمین سے کھینچ کر کبھی جہاز کے کیبن میں کھڑکی والی سیٹ پر بٹھا دیتے ہیں، تو کبھی کسی محفل میں پہنچا دیتے ہیں، کبھی کسی ریستوران کی میز پر لے جا کر کسی غیر ملکی ٹورسٹ سے اس طرح ملوا دیتے ہیں کہ دونوں بے زبانی کے باوجود ہم نوا بن جاتے ہیں۔

اگر کوئی مجھ سے کہے کہ میں الطاف یوسف زئی کے اس سفر نامے ''نیل کے سنگ'' کی کچھ خوبیاں بیان کردوں تو عرض کروں گا کہ اس تحریر کی پہلی خوبی یہ ہے کہ مسافر اپنے سفر نامے ''نیل کے سنگ'' میں اپنے ساتھ دوسروں کو شریک کر لینے میں کامیاب ہے۔

دوسری خوبی یہ ہے کہ لمحہ موجود میں عرصہ گزشتہ کو کھینچ لانے کے ہنر سے بھی واقف ہے اور اس کا یہ ہنر اس بات پر دال ہے کہ اس نے دنیائے جہان کی تاریخ کی سیر کی ہے اور اس کی بھول بھلیوں میں بھی داخل ہوتا رہا ہے۔مسافر کو جدید صورتِ حال سے آگاہی اور عصری آگہی سے بھی شناسائی ہے۔

ایک وصف یہ ہے کہ اس کی مذہبی معلومات معقول ہیں اور ان معقول معلومات کا استعمال بھی جانتا ہے۔اس کی تحریروں سے ملت کا درد بھی مترشح ہوتا ہے۔

ایک حسن یہ بھی ہے کہ وہ سفر خطبہ دینے یا طلبہ کو پڑھانے کے لیے نہیں کرتا بلکہ اس کے اسفار کا مقصد تہذیبوں کا پڑھنا اور نئے آفاق کا سمجھنا بھی ہوتا ہے۔

ایک قابلِ قدر کمال یہ بھی ہے کہ الطاف یوسف زئی اس سفر نامے میں ایک افسانوی کردار گھڑنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ دکتور محمود جوان کی خدمت اور راہنمائی کے لیے مامور کیے گئے ہیں، انھیں اپنے سفر نامے میں الطاف یوسف زئی نے ایک افسانوی کردار بنا دیا ہے جس سے سفر نامے میں ڈرامائیت اور بعض مقامات پر افسانوی کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔ مثلاً:

''دریا کے کنارے سرکار نے بیٹھنے کے لیے خوب صورت اور آرام دِہ جگہیں بنائی ہیں جہاں نیل کے تازہ ہوا کے جھونکوں کی سرمستی میں یہ نوجوان لڑکے اور لڑکیاں ایک دوسرے سے محبت کی پینگیں بڑھاتے ہیں۔۔۔۔۔ میں نے دکتور محمود سے پوچھا کہ ''آپ نے کبھی کسی کے ساتھ نیل کے کنارے پُر لطف وقت بِتایا ہے؟''، بولے ''ہائے میرے نصیب۔۔۔۔ میری غربت اس راہ میں بڑی رکاوٹ ہے''۔ میں نے پوچھا، ''اس پُر لطف وقت کے لیے کون سی امارت ضروری ہے، بس دوست بناؤ، نیل کے کنارے بیٹھو اور چند جنین کے پھول خرید کر پیش کرو۔''

''الطاف صاحب! آپ بھی بادشاہ ہو، محبوب پیسے کے بغیر ساتھ نہیں بیٹھتا۔''

اس طرح کی اور بھی کئی صورتِ حال مختلف مقامات پر دیکھنے کو ملتی ہیں جو کہانی کا مزہ دیتی ہیں۔ کہیں کہیں کچھ ایسے جملے بھی دکھائی دیتے ہیں جو الطاف صاحب کی سیاسی بصیرت کی غمازی کرتے ہیں۔ ان کے یہ دو اقتباسات ملاحظہ کیجیے:

''اس میں کوئی مبالغہ نہیں کہ انقلاب کتنا ہی پرانا کیوں نہ ہو جائے، اس

کی داستان ہمیشہ تازہ رہتی ہے۔امید اور عمل، بیداری اور خود شناسی، جنون اور لہو کی داستان بھی کہیں پرانی ہوسکتی ہے۔زمانہ اس کو بار بار دہراتا ہے۔فرق صرف نام، مقام اور وقت کا ہوتا ہے۔''

''لانچ کی ایک کھڑکی میں سبز رنگ کی بوتل نظر آئی۔میں نے بوتل کو نیل کے پانی میں خوب دھویا اور اس کو دریا کے پانی سے بھرا۔دکتور محمود بولے،''اس کا کیا کروگے؟''۔

میں نے کہا،''یہ سبز رنگ کی بوتل ہے اور پاکستان کا سرکاری رنگ اور جھنڈے کا رنگ بھی سبز ہے۔ میں اُس سبز رنگ کے ساتھ نیل کے پانی کا اشتراک چاہتا ہوں۔میری خواہش ہے کہ مصر اور پاکستان ایک دوسرے کے قریب ہوں۔اس پانی اور بوتل کی طرح۔''

نیل کے سنگ، چلنے اور ساحلِ نیل تک پہنچنے کے دوران یہ حقیقت پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ سفرنامہ سیر وسیاحت کا ایک ایسا آئینہ ہے جس میں منشائے مسافت، سودائے سیاحت ،تماشائے کشف وکرامت، ہوائے سیاست، بے گانگیِ قرابت، ادائے لطافت، فضائے ملک و ملت، سیلیِ صعوبت، لکھنے والے کی علمیت، تخلیقیت، بیان کی اثریت سبھی کچھ منعکس ہوتا ہے۔ ساتھ ہی راز ہائے سربستہ منکشف ہوتا ہے۔اوراقِ زیستِ گم گشتہ سامنے آتے ہیں۔تجرباتِ جدیدہ اور مشاہدات نادیدہ نظر آتے ہیں اور ان سب سے قلب وجگر سکون پاتے ہیں۔

ایک اچھے، معلوماتی، تخلیقی اور موثر سفرنامے لکھنے اور اپنے سنگ دریائے نیل کی ٹھنڈی ہواؤں اور مصر کی مسرور فضاؤں کی سیر کرانے پر میری طرف سے الطاف یوسف زئی کو بھرپور داد اور مبارک باد۔

نیل کے سنگ: ایک اظہاریہ

ڈاکٹر نذر عابد

(صدرِ شعبہ اردو، ہزارہ یونیورسٹی، مانسہرہ)

''نیل کے سنگ'' ڈاکٹر الطاف یوسف زئی کی سفر نامہ نگاری کی مسافت کا دوسرا پڑاؤ ہے۔ اس سے قبل وہ ''تھائی لینڈ کے رنگ'' کے نام سے اپنا تھائی لینڈ کا سفر نامہ قارئین کی نظر کر چکے ہیں۔ ان کے اولین سفر نامے کو علمی و ادبی حلقوں میں خاصی پذیرائی حاصل ہوئی۔ مقامِ اطمینان ہے کہ سفر نامہ نگاری کی تخلیقی مسافرت کے اس دوسرے پڑاؤ پر بھی سفر نامہ نگار سفر کرنے اور سفر لکھنے ہر دو حوالوں سے کسی قسم کی جسمانی، ذہنی اور روحانی تھکن کا شکار نہیں ہوا۔ ''نیل کے سنگ'' ان کے دیارِ مصر کے سفر کے احوال و تاثرات کی روداد ہے جس میں وہ ہر دم ایک تازہ دم مسافر کے روپ میں نت نئی منزلوں کی جستجو میں سرگرداں نظر آتے ہیں۔

مصر دنیا کی قدیم تہذیبوں میں سے ایک ہے جسے تاریخی اعتبار سے انسانیت کے لیے دریائے نیل کا تحفہ قرار دیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر الطاف یوسف زئی کو دنیا کی قدیم تہذیبوں سے جانکاری کے حوالے سے ایک خاص شغف ہے۔ مصر میں گزارے گئے وقت کے دوران میں انھوں نے اپنی طبعی مناسبت سے خوب کام لیتے ہوئے مصری تہذیب کی جڑوں تک رسائی حاصل کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ اس کا واضح اظہار اس سفر نامے میں مصر کے مختلف تاریخی و تہذیبی مقامات کے احوال پڑھتے ہوئے ہوتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے ایسے مقامات بیان کرتے ہوئے تاریخ سے بھرپور استفادے کے ساتھ ساتھ مقامی باشندوں میں گُھل مل کر وہاں کے ماضی و حال کے متعلق ایک تہذیبی و تمدنی منظر نامہ مرتب کیا ہے۔ تاہم اس سارے منظر نامے کو بیان

کرتے ہوئے وہ کسی مورخ جیسی خشک بیانی کی سطح پر نہیں اترے بلکہ اپنے اسلوب میں ایسے رنگ بھرے ہیں جو قاری کی دل چسپی کا سامان کرتے ہیں۔ انھوں نے مصری تہذیب کے بہت قدیم آثار اور مناظر و مظاہر بیان کرتے ہوئے بھی اپنے لہجے کی تازہ کاری کو برقرار رکھا ہے۔ یوں قاری اس سفر نامے میں بیان کردہ تاریخی حقائق سے بھی آگہی حاصل کرتا ہے اور سفر نامہ نگار کی طرف سے برتے گئے مختلف اسلوبیاتی رنگوں سے بھی حظ اٹھاتا ہے۔ مصری تہذیب و تمدن کے موجودہ خدوخال پر اظہار خیال کرتے ہوئے ڈاکٹر الطاف ایک ایسے مبصر کے طور پر سامنے آتے ہیں جس میں نہ صرف کھلی آنکھ سے، کسی قسم کے تعصب سے بالاتر ہو کر مصری سماج کا مطالعہ کیا بلکہ اس سماج کے مختلف پہلوؤں کا بالغ نظری سے ثبوت دیتے ہوئے تجزیہ بھی پیش کیا۔ اپنے اس تجزیے میں سفر نامہ نگار نے وہاں کے سماجی، سیاسی اور تعلیمی نظام کو خاص طور پر پیشِ نظر رکھا۔ یوں اس تجزیے سے دنیا کے معاصر منظر نامے میں مصری سماج کے کردار کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

امید کی جا سکتی ہے کہ ڈاکٹر الطاف یوسف زئی سفر نامہ نگاری کے اس دوسرے پڑاؤ پر بھی اپنے قاری کی توجہ حاصل کرنے میں کامیاب رہیں گے۔

نیل کے سنگ: ایک تاثر

ڈاکٹر شفیق انجم

(نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، نمل، اسلام آباد)

ہمارے محترم دوست ڈاکٹر الطاف یوسف زئی مرنجاں مرنج شخصیت ہیں۔ ملکوں ملک سیر کرتے ہیں خوش باش رہتے ہیں اور دوستوں کو خبر دیتے رہتے ہیں کہ بھئی زندگی کو یوں دیکھو۔ دنیا گول مٹول سی ایک گڑیا ہے، اس کے دھنک رنگ چہرے پہ نظریں جمائے رکھو اور چلتے رہو، زندگی بھلی لگے گی۔

ابھی کل ہی کی بات ہے ان کا سفر نامہ ''تھائی لینڈ کے رنگ'' پڑھا اور دیر تک اس کا جادو اثر دکھاتا رہا۔ اب ''نیل کے سنگ'' پڑھ رہا ہوں تو گویا دوہرے جادو کے حصار میں ہوں۔ مصر ایک ملک نہیں، ایک جادو نگری ہے۔ اس نگری کو جانے والے کم ہی سلامت دل لوٹتے ہیں۔ جہاں ایمان سنبھالے رکھنا بھی اک کام ہے لیکن دل کا جانا تو یقینی بات ہے۔ ڈاکٹر الطاف یوسف زئی نے بڑی کدو کاوش سے ایمان سنبھالے رکھا ہے لیکن دل کے معاملے میں حسبِ روایت جیت بازارِ مصر ہی کی ہوئی ہے۔ گو ہمارے مسافر کا سفر ایک علمی مقصد کے تحت تھا اور گو اس میں کچھ شک وشبہ نہیں کہ ہمارے مسافر کا سینہ وادیِ سوات کے منزہ پانیوں جیسا شفاف ہے لیکن مصر تو مصر ہے۔ باوضو نگاہیں بھی یہاں اس جادو کے سامنے بے بس ہو جاتی ہیں جو سامری کے زمانے سے بھی بہت پہلے نیل کی پیدائش کے ساتھ ہی اس مٹی پانی میں پھونک دیا گیا تھا۔

سفر نامے میں ایسے کئی مقامات آتے ہیں جہاں مسافر اس جادو کے زیرِ اثر عجب از خود رفتگی کے عالم میں نظر آتا ہے۔ مجھے وہ منظر بہت ہی بھلا لگا ہے جب کسی نسائی آواز کی گرفت میں مسافر چلتی لانچ میں نیل کا پانی اوک بھر پیتا ہے۔ اسی پر اکتفا نہیں قریب پڑی خالی بوتل بھی نیل کے پانی سے بھر لیتا ہے۔ اس وقت یہ اندازہ نہیں ہو پاتا کہ مسافر اس بوتل بھر پانی کا کیا کرے گا۔ عقدہ تب کھلتا ہے جب سفر نامے کا اختتام اسی بوتل پر ہوتا ہے۔ یہ ڈرامائی سین ہے۔ یہاں وہ دل پذیر داستان جسے پورے سفر نامے میں سفر نامہ نگار نے شعوری کوشش کے ساتھ ابھرنے نہیں دیا۔ مبادا کہ وقار پر حرف آئے؛ جوش کرتی ہوئی سامنے آجاتی ہے۔ مسافر وقتِ رخصت ائیر پورٹ پر ہے اور شدتِ جذبات میں نیل کے پانی سے بھری بوتل غٹا غٹ پیے جا رہا ہے۔ یہاں وقت رک جاتا ہے۔ سفری روداد ختم ہو جاتی ہے، لیکن قاری کے ذہن میں لکھت چلتی رہتی ہے۔۔۔ گو ہمارے سفر نامہ نگار انکسار پسند ہیں اور اپنی لکھت کے معاملے میں بھی بے نیاز لیکن واضح ہے کہ ان کے اندر ایک بڑا کہانی کار بیٹھا ہے۔ سفر نامے میں اگر سفر کے ساتھ ساتھ ناول کا سا لطف آئے اور ڈرامے کا سا اثر محسوس ہو تو جان لینا چاہیے کہ لکھنے والا غیر معمولی لکھاری ہے۔

غیر معمولی لکھاری روداد، ماجرا یا کہانی کی تدریج ترتیب اور پیش کش کے ساتھ زبان و اسلوب پر بھی خصوصی نظر رکھتا ہے۔ ہر لکھاری کی اپنی پسند اور ترجیح ہوتی ہے۔ اسلوب بنانا بھی ایک کام ہے لیکن جب لکھت ایک والہانہ وجد کے ساتھ اترے تو اس نزول میں اسلوب بھی ساتھ ہی اترتا، سنورتا چلا جاتا ہے۔ ''نیل کے سنگ'' میں یہی صورت ملتی ہے۔ بہت فطری انداز میں سب کچھ بیان ہوا اور ایسے دریچے بھی مسلسل ہیں جن سے اس متن کی سمت جھانکا جا سکتا ہے، جو بیان نہیں ہوا۔ یہ یک پرتی لکھت نہیں کہ محض بیرون کا عکس دکھائے اور دروں

تشنہ رہے۔اس میں اچھی خاصی گہری گپھائیں ہیں، کسی پراسرار سمت میں جاتے رستے ہیں، کسی رکی ہوئی چپ کیفیت اوران کہی کے نشان ہیں۔قاری اس اسلوبی روش سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ایک اچھی اور بڑی لکھت کو ایسے ہی ہونا چاہیے۔

جہاں تک سفر کے مقامات ومناظر،سفر رفیق کرداروں اور تاریخ وتہذیب کے حوالوں کا تعلق ہے؛اس سفرنامے میں اختصار کے باوجود یہ سب کچھ ایک خاص اعتدال کے ساتھ بیان ہوا ہے۔گومصر میں سفر نامہ نگار کا قیام زیادہ طویل نہیں تھا لیکن مسافر نے چشمِ تصور میں صدیوں کے منظر دیکھے اور کمال ہنرمندی کے ساتھ اس مختصر روداد میں بیان کیے ہیں۔بنیادی مکالمہ ان کا اپنے آپ ہی سے رہا لیکن مزید کی تلاش وپیش کش میں انھوں نے اپنے رفقا سے خوب کام لیا ہے۔ڈاکٹر علی، ڈاکٹر محمود، ڈاکٹر بسنت، ڈاکٹر شائمہ، شاہندہ وغیرہ اس سفرنامے کے ایسے کردار ہیں جن سے اس کہانی میں بیسیوں رنگ اترے ہیں۔اسے لکھاری کی خوبی کہیے کہ کہیں بھی انھوں نے اپنے آپ کو ان کرداروں پر حاوی کرنے کی کوشش نہیں کی۔یہ کردار مسافر ہی کی طرح جاذبِ نظر پُر اثر اور متاثر کن ہیں۔ان تمام کرداروں میں بھی وہی خلوص اور اپنائیت جھلکتی ہے جو مسافر کے اپنے کردار میں ہے۔سفرنامہ نگار نے ان کی الگ الگ شخصیت کو ابھارنے میں بڑی تخلیقی مہارت دکھائی ہے۔کمال یہ ہے کہ کسی بھی کردار کے تعارف وتعریف میں کوئی تفصیل نہیں دی گئی لیکن قاری ان کو ایسے پہچان لیتا ہے گویا سامنے بیٹھے ہیں۔رنگ روپ، تیور، مزاج، اندازِ گفتگو، سماجی وعلمی حیثیت اور دل کی اچھائی اور نیک خصلتی۔۔۔بہت کچھ بہت سہولت کے ساتھ لکھت میں سمویا گیا ہے۔

''نیل کے سنگ'' میں مسافر اور قاری کا سفر الگ الگ نہیں بلکہ ہم رکابی کی صورت لیے ہوئے ہے۔سفرنامہ نگار بڑی خوبی اور ہنر کے ساتھ پڑھنے والے کو اپنے ساتھ دوڑائے

رکھتا ہے۔ قاری مسافر کے ساتھ ایک جہاز سے دوسرے، ایک ٹرمینل سے دوسرے ٹرمینل، ایک بس سے دوسری، ایک شہر سے دوسرے شہر، ایک جگہ سے دوسری جگہ بھاگم بھاگ چلتا ہے۔ تھکتا ہے، دم لیتا ہے اور پھر چلنے لگتا ہے۔ شرم الشیخ جاتا راستا ہو، گیزہ جاتی سڑک ہو، نیل کی لانچ ہو یا تحریر اسکوئر یا بازار ہائے قاہرہ کا پیدل سفر۔ مساجد، مقابر، درس گاہیں، سیر گاہیں۔۔۔ سب کچھ نہ صرف دکھائی دیتا ہے بلکہ محسوس بھی ہوتا ہے۔ خوش الحان قاریوں کی آوازیں، اذانوں کی صدا، موسیقی۔۔۔ قہوے کی حدت اور ذائقہ، جسموں جسم ترچھے تیکھے نقش، چہروں کی خوشی و ملال۔۔۔ اہرامِ مصر کے پہلو بہ پہلو رواں دواں نیل اور شہرِ جدید و قدیم۔۔۔ یہیں کہیں تاریخ کا نقاب اترتا ہے، یوسف و زلیخا کا مصر، فراعین و موسیٰ کا مصر، حسنِ مبارک اور آج کا مصر، ساحلوں کے کنارے کنارے کی بستیاں، صحراؤں کی آبادیاں اور تاریخ کے جھروکوں سے سر ابھارتے خوش رنگ عجوبہ نگر۔۔۔ لوگ بدلے ہیں، چہرے اور لباس بدلے ہیں، مسافر اور مسافتیں بدلی ہیں، لیکن وقت کا دھارا رواں دواں ہے۔ ہمارے مسافر کی لکھت اختتام پذیر ہوتی ہے اور وہ دیکھتا ہے، نفرتتی، زلیخا اور قلوپطرہ کا دیس اور کایا کلپ ہوتی ہے۔ سامنے بسنت اور شائمہ اور شاہندہ کھڑی مسکرا رہی ہیں۔۔۔ اور یہ سب کچھ قاری بھی دیکھتا اور محسوس کرتا ہے۔

یہ ایک حیرت انگیز سفرنامہ ہے۔ لکھنے والے نے اسے کمال عالمِ وجد میں لکھا ہے اور یہ وجد قاری کی طرف بھی منتقل کر دیا ہے۔ ہم وجد و محویت میں پڑھتے جاتے ہیں اور مصر کا جادو، لکھاری کی لکھت سے ہم آہنگ ہو کر اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ سفر کہانی ختم ہو جاتی ہے۔ لیکن تصور کہانی چلتی رہتی ہے۔ یہی اس تحریر کا کمال ہے۔ کہ قاری قاہرہ کے ائیر پورٹ پر کہیں رک جاتا ہے۔ واپسی کی کہانی معلق ہو جاتی ہے۔ کوئی رخصت ہو کر بھی وہیں رہ جاتا ہے۔

''نیل کے سنگ'' پر ایک نظر

ایڈوکیٹ بشیر مراد
آزاد کشمیر

شاعری کے لیے کچھ نہیں کرنا پڑتا یہ کھڑے کھڑے ہو جاتی ہے۔بعض اوقات تو سوئے سوئے بھی سرزد ہو جاتی ہے کہ اس کا تعلق آمد سے ہے جس کے لیے جامد ہونے کی قطعاً ضرورت نہیں۔لیکن نثر کا معاملہ الگ ہے۔اس کے لیے باقاعدہ اکڑوں ہو کے بیٹھنا پڑتا ہے۔یعنی یہ وہ ریاضت ہے جو حالت رکوع میں کی جاتی ہے۔

نثری اصناف میں سفر نامہ تو اور بھی جوکھم کا کام ہے کہ اس کی طلب میں سفر بھی کرنا پڑتا ہے جو بسا اوقات انگریزی کا Suffer ثابت ہوتا ہے۔گویا یہ ادب کی ایسی صنفِ گراں بار ہے جس کو صنفِ نازک کی طرح قابو کرنا آسان نہیں ہوتا۔اس کے حصول کے لیے شدید ماراماری اور بے تحاشا جتن کرنے پڑتے ہیں۔پہلے سفر کرنے کا سلیقہ اور پھر اسے بیان کرنے کا قرینہ ہونا چاہیے۔

ہمارے دوست ڈاکٹر یوسف میر کی محبت کہ ڈاکٹر الطاف یوسف زئی کا مصری سفر نامہ ارسال کیا۔مشاہدہ عام ہے کہ یوسف نام کے لوگ خوب صورت ہوتے ہیں۔پھر بندہ ذات کا بھی یوسف زئی ہو اور مصر سے محبت نہ ہو یہ کیسے ممکن ہے۔پس یہ طے ہے کہ یہ سفر نامہ سراسر فطری محبت کا شاخسانہ ہے۔اگر یقین نہ آئے تو پڑھ کر دیکھ لیجیے۔

کچھ سفر نامے تو محض سفر کی صعوبت برداشت کرنے کی خاطر لکھے جاتے ہیں جن کے پڑھنے سے قاری کو بھی شدید تھکاوٹ ہوتی ہے۔اس قبیل کے سفر نامے یوں شروع ہوتے ہیں۔

''میں صبح سویرے جاگا، ناشتہ کیا، گاڑی کا ٹکٹ لیا، گاڑی میں بیٹھا۔مسافر آپس میں باتیں

کر رہے تھے۔ڈرائیور جاگ رہا تھا چناں چہ میں سو گیا۔شام فلاں جگہ آنکھ کھلی، ہوٹل کے تہ خانے میں جگہ نہیں تھی ، بالائی منزل پر کمرہ ملا۔ پیٹ بھر کے کھانا کھایا اور دوبارہ سو گیا۔ اگلے دن پھر سویرے جاگا اور۔۔۔'' اور پھر سے گزشتہ کل کے سارے معمولات و نامعقولات لگ بھگ اسی چلن سے دہرا دیے جاتے ہیں۔ایسے سفر نامے پڑھنے کے بعد قارئین کرام حیران و پریشان سوچتے ہیں کہ اگر ان صاحب کو کسی ذاتی تکلیف کے زیرِ اثر یونہی بے مقصد گھومنا پھرنا تھا تو ہمیں اپنے ساتھ باندھ کے کیوں خجل کیا۔

دوسرے طرز کے سفر نامے وہ ہوتے ہیں جو مقصدیت کے حامل ہوتے ہیں اور اس کے پڑھنے کے بعد پڑھنے والے کا دامن با مقصد معلومات سے بھر جاتا ہے۔اس سرمستی اور سرشاری سے ہم کنار قاری سفری زچگیاں بخوشی بھول جاتا ہے۔

''نیل کے سنگ'' بھی ایک ایسا ہی با مقصد اور باوقار سفر نامہ ہے جس کے مطالعے سے جہاں زبان و بیان کی سطوت اور دل کشی عیاں ہوتی ہے وہاں مصر کی تاریخ و ثقافت با تصویر نظر آتی ہے۔ اسے پڑھتے ہوئے آپ کبھی فراعینِ مصر کے ساتھ دست و گریباں ہوتے ہیں اور کبھی حسینانِ مصر کے ہاتھوں چاک داماں۔۔۔کہیں عرب کے ریگزاروں

کی جھلک تو کہیں یورپ کے سمن زاروں کی مہک۔۔۔

ڈاکٹر الطاف یوسف زئی کی وسعتِ نظر کبھی ہندوستان کی تاریخ کی سمت اُٹھتی ہے تو کبھی کشمیر کے لالہ زاروں میں بہنے والے شفق رنگ لہو کا طواف کرتی ہے۔ان کے فکر و نظر کی یہ گہرائی اور گیرائی عمیق کا مشاہدہ کرتی ہے اور اسی مطالعے کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے جس کی تفہیم کے لیے قاری کو بھی بالغ نظر، باشعور بلکہ باوضو ہونا چاہیے۔کرۂ ارض کا شاید ہی کوئی گوشہ ایسا باقی بچا ہو جہاں ہمارے سفر نامہ نگاروں نے دھمال نہ ڈالی ہو۔ایک ایک ملک کے درجنوں سفر نامے موجود ہیں۔ ظاہر ہے نہ تو مناظر اتنی سرعت سے اپنی ہئیت تبدیل کرتے ہیں اور نہ ہی ایک تصویر کو بار بار دیکھا

جا سکتا ہے۔ ایسے میں اچھے تخلیق کار کا کمال یہ ہوتا ہے کہ وہ کس طرح دوسروں سے خود کو الگ کرتا ہے اور کس زاویے سے نقشِ کہن کو اپنے تازہ تخیل کے رنگوں سے رنگین کرتا ہے۔

''نیل کے سنگ'' پڑھنے سے یہ احساس پختہ ہوتا ہے کہ ڈاکٹر یوسف زئی نہ صرف اس فن سے آشنا ہیں بلکہ اسے برتنے کا ہنر بھی خوب جانتے ہیں۔ بظاہر وہ ایک کہنہ جادہ و منزل کے راہ رو ہیں جس کی روداد پہلے بھی رقم ہو چکی ہے لیکن انھوں نے اپنی جودتِ طبع سے ایک ایسی جوت جگائی ہے کہ ہمیں پرانی راہوں پر نئی روشنی کی قندیلیں جگمگاتی نظر آتی ہیں۔

جہاں ان کے تخیل کی کارفرمائی ہمیں شش جہات کے مناظر دکھاتی ہے تو وہاں روایت اور جدت کے امتزاج سے ابھرتا ہوا ان کا اسلوب ہمیں قوسِ قزاح کے رنگوں سے ہم کنار کرتا چلا جاتا ہے۔ رنگوں کی اس رنگا رنگی میں رنگا ہوا قاری بارضا و رغبت ان کے تخیل کے ساتھ اڑان بھرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ ایک تخیل کار کا معجزہ ہے کہ وہ قاری کو جو

دکھانا چاہتا ہے قاری اسی سہولت سے دیکھتا چلا جاتا ہے ورنہ تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ ادھر سفر نامہ نگار چولستان کے دشت کی ریگ پھانک پھانک کے ہلکان ہو رہا ہے تو اُدھر قاری صاحب ہنوز ملتان کے گلگشت میں ہی مٹر گشت فرما رہا ہے۔ اس پر اگر سفر نامہ نگار زیادہ کھینچ تان کرتا ہے تو وہ کتاب بند کر کے لمبی تان لیتا ہے۔

اس کے برعکس ڈاکٹر الطاف یوسف زئی کو یہ فن خوب آتا ہے کہ وہ قاری کو اپنی انگلی تھما کر آرام سے گھما پھرا سکتے ہیں۔ بلکہ موقع پا کر اغوا بھی کر سکتے ہیں۔

ہمیں وہ رشید احمد صدیقی، مشتاق احمد یوسفی اور مختار مسعود کے معتقدین کی صف میں نظر آتے ہیں اور جو اہلِ ادب ان مرحوم و مغفور بزرگوں کو قریب سے جانتے ہیں وہ یہ بھی ضرور مانتے ہیں کہ تینوں اپنے اپنے اسلوب کے پیش امام تھے۔

سفر ہے شرط۔۔۔۔

ڈاکٹر عارف حسین عارفؔ

دنیا کی سیر کرنا، آنکھوں سے دیکھنا اور لفظوں میں دکھانا سب مختلف ہنر ہیں۔ جو شخص دنیا کی سیر کا حوصلہ رکھتا ہے وہ اپنی آنکھیں اور دل کھلا رکھے اور قلم رواں رکھے تو اس کا سفر نہ صرف اپنا سفر رہ جاتا ہے بلکہ وہ اپنے ساتھ ساتھ دوسروں کو بھی، جو کبھی قیدِ مقام سے نہیں گزرے، اپنے ساتھ ساتھ لیے پھرتا ہے۔ سفر نامہ نگار کی یہی خوبی ہوتی ہے کہ وہ ایک افسانوی فضا قائم کرتے ہوئے داستانوی ماحول بناتے ہوئے، قاری کو اس طرح اپنی گرفت میں لیتا ہے کہ اُس کے ذہن کی سکرین پر وہ تمام مناظر اپنا عکس لیے ساتھ ساتھ چلتے جاتے ہیں۔

ڈاکٹر الطاف یوسف زئی کا سفر نامہ ''نیل کے سنگ'' اس لحاظ سے ایک منفرد سفر نامہ ہے کہ جس میں داستانوی عنصر بھی پایا جاتا ہے اور افسانے کا اختصار بھی۔ انھوں نے چند صفحات میں ہی مصر کی ایسی سیر کرادی ہے کہ جو آدمی ایک مہینہ میں بھی شاید نہ کر سکتا ہو۔ تاریخ کی بھاری بھرکم کتابوں کو ہاتھ لگانے سے ڈر لگتا ہے اور پھر ان کا اسلوب بھی اتنا دل خراش ہوتا ہے کہ ایک آدھ صفحے کے بعد کتاب کو طاق پہ سجا دینا ہی مناسب لگتا ہے مگر الطاف صاحب نے سفر نامے کو اس طرح خوبصورت اسلوب اور دل کش پیرائے سے مزین کیا ہے کہ قاری ساتھ ساتھ سفر کرتا چلا جاتا ہے۔ سب سے بڑھ کر ان کے اسلوب میں جو برمحل اشعار اور احادیث اور اسلامی روایات کا استعمال ہے وہ ان کی علمیت کی خبر بھی دیتا ہے اور ساتھ ہی قاری کو ایک اسلامی اور ادبی روایت سے بھی منسلک کرتا جاتا ہے۔ ان کے اسلوب میں مزاح کی چاشنی بھی موجود ہے اور کہیں کہیں جب وہ پاکستانی یا اسلامی کلچر کے ساتھ موازنہ کرتے دکھائی دیتے ہیں تو ان کے قلم سے محبت آمیز طنز بھی برآمد ہوتا دکھائی دیتا ہے۔

اس کامیاب سفر نامے پر ڈاکٹر الطاف یوسف زئی کو بھرپور مبارک باد پیش کرتا ہوں اور ان کے قلم کی روانی اور برجستگی کے دعا گو ہوں۔

اردو ادب میں جن قلم کاروں نے مختلف ادبی حوالوں سے اپنی شناخت قائم کی اور جن کو اعتبار حاصل ہوا ان میں ایک نمایاں نام ڈاکٹر الطاف یوسف زئی کا بھی ہے۔اس بات سے ہر شخص کما حقہٗ واقف ہے کہ اعلیٰ درجہ کی تخلیق صرف اعلیٰ ترین ذہنوں میں ہی پیدا ہوتی ہے۔اعلیٰ ترین ذہن وہ ہوتا ہے جس میں شعور کی بالیدگی ،بصیرت کی براقی اور احساس کی شدت ہوتی ہے۔جس میں بیک وقت مفکر، دانش ور اور آرٹسٹ تینوں کی آمیزش ہوتی ہے۔ ڈاکٹر الطاف یوسف زئی ایسے ہی ذہن کے مالک ہیں۔جس کا ثبوت ان کا وہ ادبی سرمایہ ہے جس میں تخلیق، تنقید، تحقیق ہر طرح کے حوالے موجود ہیں اور کمال کی بات یہ ہے کہ یہ نمونے نثری اور شعری دونوں سانچوں میں ڈھلے ہوئے ہیں۔تقریباً نصف درجن سے زائد کتابیں منظرِ عام پر آ چکی ہیں جو ان کی خلاقی، ،قادرالکلامی، اور عمیق مشاہدے اور وسعتِ مطالعہ کی غماز ہیں۔ڈاکٹر الطاف یوسف زئی درس و تدریس کے پیشے سے وابستہ ہیں اور اس وقت ہزارہ یونیورسٹی مانسہرہ کے شعبہ اردو میں پروفیسر کے عہدے پر فائز ہیں۔ان کی تصنیفات میں اردو اور نظم 9/11 ،مختار مسعود کا اسلوب (تین ایڈیشن)،مشتاق احمد یوسفی کے پٹھان کرداروں کا پشتو ترجمہ،تھائی لینڈ کے رنگ (سفر نامہ)، شعری اصناف اور مختار مسعود کی شہرہ آفاق تصنیف ’’آوازِ دوست‘‘ کا پشتو ترجمہ، نہایت اہمیت کی حامل ہیں۔مشتاق احمد یوسفی کے پٹھان کرداروں کا پشتو ترجمہ پر ہائیر ایجوکیشن کمیشن پاکستان کی جانب سے پانچ لاکھ روپے کا انعام بھی پیش یا جا چکا ہے۔الطاف یوسف زئی کا تخلیقی سفر دریا کے پانی کی طرح رواں دواں ہے۔جس کا ثبوت ان کا تازہ ترین سفر نامہ ’’نیل کے سنگ‘‘ ہے۔ یہ ایک بہت ہی خوبصورت ،معلومات افزا اور دل چسپ سفر نامہ ہے۔جس سے مصر کا مذہبی، سیاسی ،تہذیبی ،معاشرتی اور تعلیمی منظر نامہ بڑے ہی دل کش پیرائے میں سامنے آتا ہے۔توقع ہے کہ ڈاکٹر الطاف یوسف زئی کی اس کاوش کو ادبی حلقوں میں خوب سراہا جائے گا۔

ڈاکٹر ریشا قمر گلبرگہ یونیورسٹی، انڈیا